علمی و تحقیقی مجلہ

ثقافتی قونصلیٹ سفارت اسلامی جمہوریہ ایران۔ اسلام آباد

پیغامِ آشنا

جلد ۲۲، شمارہ ۹۳، سال ۲۰۲۳ء
(اکتوبر تا دسمبر)

علامہ اقبال نمبر

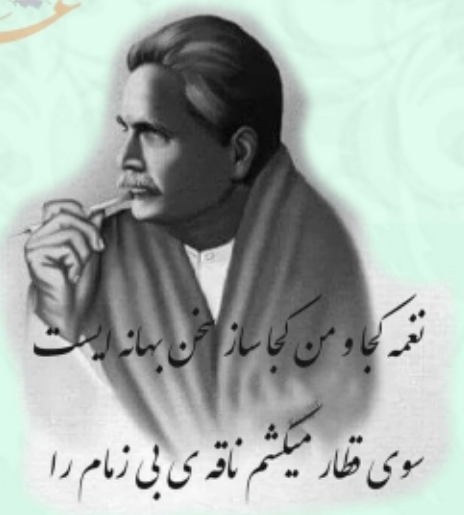

ISSN: 2079-4568

بسم الله الرحمن الرحیم

اہم گزارشات

- ایران اور پاکستان صدیوں سے دوستی اور اخوت کے بے شمار رشتوں میں منسلک ہیں۔ پیغام آشنا کے اجراء کا مقصد ان دونوں ملکوں کے درمیان اس خطے کی مشترکہ علمی، ادبی، تاریخی اور ثقافتی میراث کو محفوظ اور مستحکم بنانا ہے۔
- پیغام آشنا ایچ۔ای۔سی سے منظور شدہ تحقیقی مجلہ ہے جس میں فارسی اور اردو زبان و ادب کے حوالے سے غیر مطبوعہ مقالات ''ایچ ای سی'' کے طے کردہ ضوابط کے مطابق شائع کیے جاتے ہیں۔
- مقالے کا ''ایچ ای سی'' کے مجوزہ روش تحقیق اے، پی اے (APA) پر مشتمل ہونا لازمی ہے۔
- تمام مقالات مجلس مشاورت کی منظوری کے بعد شائع کیے جاتے ہیں۔
- اشاعت کے لیے قبول کیے جانے والے مقالات میں ادارہ ضروری ادارتی ترمیم، تنسیخ اور تلخیص کا حق محفوظ رکھتا ہے۔
- مقالہ ارسال کرتے ہوئے درج ذیل اصولوں کو ملحوظ رکھا جائے جو کہ آج کے ترقی یافتہ علمی دنیا میں بالعموم رائج ہیں۔ مقالہ اے فور جسامت کے کاغذ پر ایک ہی جانب کمپوز کروا کر بھیجا جائے۔ مقالے کے ساتھ اردو اور انگریزی زبان میں خلاصہ (Abstract) (تقریباً ۱۰۰ الفاظ) کلیدی الفاظ اور عنوان ضرور شامل کیا جائے۔ مقالے کی سی ڈی بھی ساتھ ضرور ارسال فرمائیں۔ یعنی مقالہ کی ''ہارڈ'' اور ''سوفٹ'' کاپی دونوں ارسال کی جائیں۔
- مقالہ کے عنوان کا انگریزی ترجمہ، مقالہ نگار کے نام کے انگریزی ہجے اور موجودہ عہدہ، نیز مکمل پتہ، برقی پتہ اور فون نمبر درج کیا جائے۔

ہائیر ایجوکیشن کمیشن پاکستان سے منظور شدہ

سہ ماہی

پیغامِ آشنا

(علامہ اقبال نمبر)

جلد۔۲۲،شمارہ۔۹۳، سال ۲۰۲۳ء

(اکتوبر تا دسمبر)

مدیر اعلیٰ

احسان خزاعی

مدیر(اعزازی)

ڈاکٹر علی کمیل قزلباش

ثقافتی قونصلیٹ

سفارت اسلامی جمہوریہ ایران۔اسلام آباد

مکان نمبر ۲۵،گلی نمبر ۲۷،ایف ۲/۶،اسلام آباد۔

فون نمبر :۸۔۷۹۳۷ ۲۸۲ ۰۵۱ فیکس ۴۷۷۱۷۲۸۲ ۰۵۱

برقی پتہ :iran.council@gmail.com,payghameashna@gmail.com

ویب سائٹ:http://ur.icro.ir/IslamAbad

Facebook address: https://www.facebook.com/raiezani/

ISSN:2079-4568

مجلس ادارت

افتخار عارف، سابق ڈائریکٹر جنرل، ادارہ فروغ اردو، اسلام آباد

پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم اختر، سابق استاد قائداعظم یونیورسٹی۔ اسلام آباد

ڈاکٹر ہلال نقوی، پاکستان اسٹڈی سنٹر، کراچی یونیورسٹی، کراچی

ڈاکٹر مہر نور محمد خان، سابق صدر، شعبہ فارسی، نمل یونیورسٹی، اسلام آباد

ڈاکٹر محمد یوسف خشک، سابق چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان۔ اسلام آباد

ڈاکٹر شگفتہ موسوی، سابق صدر شعبہ فارسی، نمل اسلام آباد

ڈاکٹر امبر یاسمین، صدر، شعبہ فارسی نمل۔ اسلام آباد

مجلس مشاورت

ڈاکٹر ابراہیم محمد ابراہیم، صدر، شعبہ اردو، الازہر یونیورسٹی، قاہرہ، مصر

ڈاکٹر حیدر رضا ضابط، اسلامی تحقیقی مرکز، آستان قدس رضوی، مشہد، ایران

ڈاکٹر خلیل طوق آر، صدر، شعبہ اردو، انقرہ یونیورسٹی، استنبول، ترکی

پروفیسر ڈاکٹر خالد محمود خٹک۔ صدر، شعبہ اردو، جامعہ بلوچستان۔ کوئٹہ

پروفیسر سحر انصاری، انجمن ترقی اردو، کراچی

ڈاکٹر عبداللہ جان عابد، صدر، شعبہ پاکستانی زبانیں، علامہ اقبال یونیورسٹی، اسلام آباد

ڈاکٹر عراق رضا، صدر، شعبہ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی، ہندوستان

ڈاکٹر علی بیات، صدر، شعبہ اردو، تہران یونیورسٹی، تہران

ڈاکٹر محمد ناصر، صدر، شعبہ فارسی، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

ڈاکٹر نجیبہ عارف، چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان۔ اسلام آباد

فہرست

اداریہ		
اقبال کا فارسی آمیز قولِ محال	نوید احمد گل	۸
علامہ محمد اقبال سے فارسی گو شعرائے پاکستان کا اظہارِ عقیدت	مسرت واجد/عصمت درانی/مصطفیٰ حیدر زیدی	۲۲
تشریح وتوضیح خطبہ اول اقبال "علم اور مذہبی تجربہ" از ڈاکٹر جاوید اقبال (تجزیاتی مطالعہ)	محمد خرم یاسین/محمد ارشد اویسی	۳۴
اقبال کی شعری ہمہ گیریت	قندیل بدر	۴۳
تفہیمِ اقبال کے حوالہ سے دو خط	مصطفیٰ زیدی	۵۵
علامہ اقبال کا جوانوں کے نام پیغام و دعا	طیب نواز/تحسین بی بی	۶۷
"شکوہ" "جواب شکوہ" اور اسلامی نو آبادیات	رضوانہ نقوی	۷۶
فروغِ اردو میں اقبال کی خدمات کا مختصر جائزہ	مصطفیٰ عباس/ثمرہ ضمیر	۸۸
اقبال کی نظم "مسجد قرطبہ" کا عروضی مطالعہ	ضیاء الرحمان/ جویریہ خان	۹۶
فلسطین کی موجودہ صورت حال اور مسلم امہ (کلام اقبال کی روشنی میں)	بی بی تانیہ	۱۰۵

★★★

اداریہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال پاکستان کی سرزمین کا شاعر ہے اسی نسبت سے انہیں ہم ایرانی اقبال لاہوری کہتے ہیں لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ایران بھی اقبال کو اپنا شاعر سمجھتا ہے بلکہ انقلاب اسلامی ایران ان کے افکار کا مرہون منت ہے ہمیں خوشی ہے کہ 'پیغام آشنا' کا موجودہ شمارہ اقبال نمبر کے طور پر آپ کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے اور اس شمارے کے اداریے میں ایران کے سپریم لیڈر حضرت آیت اللہ خامنہ ای کی کتاب ''اقبال مشرق کا بلند ستارہ'' سے کچھ اقتباسات پیش کرتا ہوں۔

''اقبال تاریخ اسلام کی ان نمایاں، عمیق اور اعلیٰ شخصیتوں میں سے ہیں کہ ان کی خصوصیات اور زندگی کے صرف ایک پہلو کو مدنظر نہیں رکھا جاسکتا اور ان کی صرف اس پہلو اور اس خصوصیت کے لحاظ سے تعریف نہیں کی جاسکتی۔ اگر ہم صرف اسی پر اکتفا کریں اور کہیں کہ اقبال ایک فلسفی ہیں اور ایک عالم ہیں تو ہم نے حق ادا نہیں کیا۔ اقبال بلاشک ایک عظیم شاعر ہیں اور ان کا شمار بڑے شعراء میں ہوتا ہے۔ اقبال کے اردو کلام کے بارے میں اردو زبان و ادب کے ماہرین کہتے ہیں، بہترین ہے، شاید یہ تعریف، اقبال کی بڑی تعریف نہ ہو کیونکہ اردو زبان کی ثقافت اور نظم کا سابقہ زیادہ نہیں ہے لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کے اردو کلام نے بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں برصغیر کے افراد پر (خواہ ہندو ہوں یا مسلمان) گہرا اثر ڈالا ہے اور ان کو اس جدوجہد میں جو اس وقت تدریجی طور پر بڑھ رہی تھی، زیادہ سے زیادہ جوش دلایا ہے۔ خود اقبال بھی مثنوی اسرار خودی میں کہتے ہیں:

باغبان زور کلامم آزمود مصرعی کارید و شمشیری درود

اقبال کا فارسی کلام بھی میرے نزد شعری معجزات میں سے ہے۔ ہمارے ادب کی تاریخ میں فارسی میں شعر کہنے والے غیر ایرانی بہت زیادہ ہیں لیکن کسی کی بھی نشان دہی نہیں کی جاسکتی جو فارسی شعر کہنے میں اقبال کی خصوصیات کا حامل ہو۔

انہوں نے سعدی اور حافظ کے دیوان اور مثنوی مولانا اور سبک ہندی کے شعراء مثلاً عرفی، نظیری اور غالب دہلوی نیز دیگر شعرائے کرام کے کلام کو پڑھ کر فارسی سیکھی۔ اگرچہ وہ فارسی کے ماحول میں نہیں رہے تھے اور انہوں نے فارسی کی پرورش گاہ میں کبھی زندگی نہیں گزاری تھی لیکن انہوں نے لطیف ترین، دقیق ترین اور نایاب ترین ذہنی مضامین کو اپنی (بعض نہایت اعلیٰ) نظموں کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا اور یہ چیز میری رائے میں اعلیٰ شعری استعداد اور صلاحیت ہے۔ اگر آپ ان لوگوں کے اشعار کو دیکھیں جو ایرانی نہیں تھے لیکن انہوں نے فارسی میں کلام کہا تھا اور ان کا اقبال کے کلام سے موازنہ کریں تو آپ کے لیے اقبال کی عظمت واضح ہو جائے گی۔

اقبال ایک عظیم شاعر ہے ان کے بعض فارسی اشعار عروج پر پہنچے ہوئے ہیں۔ اقبال نے مختلف سبکوں مثلاً ہندی، عراقی اور حتیٰ کہ سبک خراسانی میں بھی شعر کہے ہیں اور ان تمام سبکوں میں اچھے شعر کہہ چکے ہیں۔ انہوں نے مختلف شعری ہیئتوں یعنی مثنوی، غزل، قطعہ، دوبیتی اور رباعی کا استعمال کیا ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اچھے شعر کہے ہیں اور اعلیٰ مضامین کو باندھا ہے۔ بعض اوقات تو ان کا کلام ساتویں آسمان کو چھوتا ہے۔"

پاک ایران دوستی پائندہ باد

احسان خزاعی

اقبال کا فارسی آمیز قولِ محال

نوید احمد گل*

Iqbal ka Qaul–e-Muhal

Dr. Naveed Ahmad Gill

Allama Iqbal(1938 A.D.(is a unique poet of Urdu and Persian. His thoughts and art impressed the entire world. In this research article his paradoxes are arranged. Here his paradoxes are also discussed according to their worth of thought as well as his artistic flavors under the light of his Kuliyat-e-Iqbal)Urdu(only. This article will be an artistic discourse.

Keywords: Qual-e-muhal, Iqbal, paradox, Urdu, Farsi

شخص ایک ہوتا ہے۔ وقت ایک ہوتا ہے۔ جگہ ایک ہوتی ہے اور روّیہ بھی ایک ہوتا ہے اس روّیہ کے دو متضاد تاثُر نظر آتے ہیں۔ سائنس، منطق اور فلسفہ کی رُو سے اجتماعِ ضدین محال ہے۔ فطرتِ انسانی اور سماجیات کی تاریخ بَشر یات اسے درست بلکہ درست تر قرار دیتی ہے۔ ایسی صورت میں اگر وہ بشر دو متضاد رویے پیش نہیں کرتا تو اس کے شعور بلکہ ایمان تک کو مشکوک گردانا جاتا ہے اس ساری کیفیت کو ادبیات میں قولِ محال (paradox) کہتے ہیں۔ 'الا اللہ' کے ساتھ 'لا' کتنا ضروری ہے اور ایک مومن کے لیے رُحَمَا بینَھُم (الفتح 29 :) کے ساتھ ساتھ اشِدَّاء علی الکفار (الفتح 29 :) برابر کا درکار ہے۔ بیوی سے محبت کا تقاضا، دوسری نامحرم خواتین سے عدم مِحبت کا رویہ محبت زِوجین کا اساسی رکن ہے۔ انسان اور انسان کی زندگی کو ادبی اصطلاح میں بیان کرنا پڑ جائے تو وہ فقط ایک ہی اصطلاح ہے وہ ہے paradox۔ قولِ محال ادب کی ایک ادا ہے اور ادائیں ہی کسی عام سے انسان کو محبوب بنا دیتی ہیں اس طرح قولِ محال بھی ایک عام سی بات کو ادبی رنگ ڈھنگ سے پُر ادا بنا دیتا ہے۔

* ایسوی ایٹ پروفیسر فارسی، گورنمنٹ گریجویٹ کالج سول لائنز، شیخوپورہ

اس مضمون میں اقبال کے چند اردو مگر فارسی آمیز اقوالِ محال کی جمع آوری کی گئی ہے۔ اقبال کے متن کی روشنی میں ان کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اقبال کا ایک قولِ محال" خاموشی گفتگو ہے" جو اقبال کے اردو کلام اور فارسی کلام دونوں میں سب زیادہ لایا گیا ہے۔ اس پر ایک جداگانہ مضمون اسی مجلّہ میں چھپ چکا ہے (نوید احمد گل، 2022، 20-9)۔ اب اس قولِ محال کے علاوہ اقبال کے اقوالِ محال کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں سرِ دست فقط اقبال کی اردو کلیات کو موضوع بنایا جاسکا ہے۔

ایک بندۂ مومن جب اطاعت اور ضبطِ نفس کے مراحل طے کر کے نیابتِ الٰہیہ کے درجہ پر پہنچ جاتا ہے تو وہ کیسے" کُلَّ یَومٍ ھُوَ فی شَانٍ" (الرّحمٰن 29 :)۔ اس نظم کو ذرا اقبال کے قولِ محال کے حوالہ سے دیکھیے:

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن — گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان!
قہاری و غفّاری و قدّوسی و جبروت — یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی — ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن — قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآن!
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے — دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو، وہ شبنم — دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

اقبال، محمد، علّامہ، 2007 (بارِ ہشتم)" کلیاتِ اقبال اردو" پاکستان، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ص 573

یہاں سے اقبال کے چند مُفرد اقوالِ محال کا ذِکر کیا جاتا ہے۔

" آرام در آزار، جان در موت اور زندگی در شعلہ" : اس یک شعر میں علّامہ اقبال نے تین اقوالِ محال یکجا کر دیے ہیں جو بظاہر ممکن نہیں لیکن اگر بات پروانہ کی ہو تو ممکن ہے جو فنا میں اپنی ارتقا اور بقا حاصل کرتا ہے:

آزارِ موت میں اسے آرامِ جاں ہے کیا؟ — شعلے میں تیرے زندگیِ جاوداں ہے کیا؟

(ایضاً، ص، 72)

قُربِ فراق آمیز : ہندستان کی خاک میں اصل وصل تو نصیب ہی نہیں اور یہ ہلکا سا قُرب بھی جدائی کا پیش خیمہ ہوتا ہے :

سر زمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے — وصل کیسا، یاں تو اک قربِ فراق آمیز ہے

(ایضاً، ص 73)

ظلمتِ پُرنور : اقبال اپنی نظم "تصویرِ درد" میں یہی کہا ہے کہ تمام تر کوشش کے باوجود برطانوی ہند کے غلام نوجوان مسلمان کو مٹایا نہیں جا سکتا :

یہ سب کچھ ہے مگر ہستی میری مقصد ہے قدرت کا سراپا نور ہو جس کی حقیقت، میں وہ ظلمت ہوں

(ایضاً،ص 99)

پیدائیِ حجاب آمیز : یہاں غزل کے رنگ میں اقبال کا کرمِ مزید کی التجا کا ایک خوبصورت انداز یہ بھی ہے:

حرم کے دل میں سوزِ آرزو پیدا نہیں ہوتا کہ پیدائی تری اب تک حجاب آمیز ہے ساقی

(ایضاً،ص 351)

کشادگیِ بے فراغت : یہ کیسی فراغت ہے کہ درمیان میں معلّق کر کے اپنی ظلم طرازی کے مزے لیے جا رہے ہیں:

نہیں اس کھلی فضا میں کوئی گوشۂ فراغت یہ جہاں عجب جہاں ہے، نہ قفس نہ آشیانہ

(ایضاً،ص 353)

تغافلِ التفات آمیز : خالص تغزّل کا رنگ ہے اقبال کبھی کبھی ایسے شعر بھی کہہ لیتے تھے:

نہ چھین لذتِ آہِ سحر گہی مجھ سے نہ کر نگہ سے تغافل کو التفات آمیز

(ایضاً،ص 354)

وحدتِ کثرت اسیر : زندگی دو ایسے ہی بظاہر متضاد مگر غیر اعادہ رویوں کا مجموعہ بلکہ آمیزہ ہے:

یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر مگر ہر کہیں بے چگوں، بے نظیر

(ایضاً،ص 453)

خاشاکِ شعلہ خور : عام طور پر آگ خرمن کو جلاتی ہے مگر سماجی طور پر موسمیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے خاشاکِ شعلہ خور سے آگاہ رہنا چاہیے:

مرا ایماں تو ہے باقی و لیکن نہ کھا جائے کہیں شعلے کو خاشاک!

(ایضاً،ص 485)

قیامتِ برہم : قیامت، قیام اور قائم سے ہے۔ یہ برہم نہیں ہوتی مگر دُنیا میں ایسا ہوتا ہے اور محشر میں ہر ایک اپنے وجود کے سِرّ کو بے پردہ دیکھ لے گا:

گرچہ برہم ہے قیامت سے نظامِ ہست و بود ہیں اسی آشوب سے بے پردہ اسرارِ وجود

(ایضاً،ص 719)

یہاں سے وہ اقوالِ محال شروع ہوتے ہیں جنہیں اقبال ایک سے زائد بار لائے ہیں۔

زندانی آزاد : شمشاد کا درخت علّامہ کے بقول بیک وقت دو متضاد کیفیات لیے ہوئے ہے :

دل سوختۂ گرمیِ فریاد ہے شمشاد زندانی ہے اور نام کو آزاد ہے شمشاد

(ایضاً،245)

آزادِ پابہ گل : اقبال کے مطابق صنوبر کا حال بھی شمشاد جیسا ہی ہے :

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے، پا بہ گل بھی ہے انھی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تُو کر لے

(ایضاً،ص278)

بندۂ آزاد : بندہ کے لغوی معنی غلام کے ہیں علّامہ بندۂ آزاد کا قولِ محال عام لاتے ہیں:

اثر کرے نہ کرے سن تو لے مری فریاد نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد

(ایضاً،ص348)

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

(ایضاً،ص352)

ویرانۂ آباد : علّامہ اقبال 1908ء میں لندن سے واپس آرہے ہیں اور لندن والوں سے یہ کہتے ہیں :

رخصت اے بزمِ جہاں سوئے وطن جاتا ہوں میں آہ ! اس آباد ویرانے میں گھبراتا ہوں میں

(ایضاً،ص95)

ہیں گرچہ بلندی میں عمارات فلک بوس ہر شہر حقیقت میں ہے ویرانۂ آباد

(ایضاً،ص722)

صیدِ صیادِ نخچیر : سرمایہ داری نظام میں فیکٹری کا مالک مزدور کو اپنا غلام سمجھتا ہے جبکہ اس کی تمام دولت مزدوری کی وجہ سے ہے:

فطرت کی غلامی سے کر آزاد ہنر کو صیاد ہیں مردانِ ہنر مند کہ نخچیر

(ایضاً،ص629)

منعمِ سرمایہ دار : ابلیس یہ کہہ رہا ہے کہ میں نے سخی کو سخاوت سے روک دیا ہے اور اسے پیسے بچا رکھنے کی تلقین کی ہیں

ساتھ ہی غریب کو یہ بتایا ہے کہ تیری تقدیر ہی ایسی ہے:

میں نے ناداروں کو سکھلا یا سبق تقدیر کا　　میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں

(ایضاً ص 702)

درندگانِ مہذّب : یہ دنیا کے خود ساختہ امیر ملک بلیوں اور کتوں کو بچاتے ہیں اور انسانوں کو مارتے ہیں اور مسلمانوں تو بالکل مٹاتے چلے جارہے ہیں:

دنیا کو ہے پھر معر کہ روح و بدن پیش　　تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا

(ایضاً ص 714)

یہاں سے اقبال کے محبوب اور محبوبیّت والے اقوالِ محال لائے گئے ہیں۔

برقِ نخل شاداب : بجلی کے گرنے سے پودے جل جاتے ہیں مگر جب یہ بجلی محبوب کے حسن کی ہو تو کچھ اور ہی رنگ ہوتے ہیں:

عشق کے دام میں پھنس کر یہ رِہا ہوتا ہے　　برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے

(ایضاً ص 94)

غلامی آزادی نثار : آزادی کے لیے جان قربان کر دی جاتی ہے مگر جب غلامی رسول پاک ﷺ کی ہو تو اس غلامی پر صدہا آزادیاں نثار کی جاسکتی ہیں:

ہوئی اسی سے ترے غم کدے کی آبادی　　تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی

(ایضاً ص 106)

ستم پُر مزا : ستم سہنے میں بیزاری ہے، بے بسی ہے، موت ہے مگر جب یہ سب ستم محبوب کے لیے اٹھے جائیں اور محبوب کوئی عام نہ ہو بلکہ محبوبِ الٰہی ﷺ ہو تو یہ سب مناسب ہے جائز ہے روا ہے بجا ہے :

وہ آستاں نہ چُھٹا تجھ سے ایک دَم کے لیے　　کسی کے شوق میں تُو نے مزے ستم کے لیے

(ایضاً ص 107)

اس شعر کا مجموعی تاثر قولِ محال لیے ہوئے ہے:

جفا جو عشق میں ہوتی ہے وہ جفا ہی نہیں　　ستم نہ ہو تو محبّت میں کچھ مزا ہی نہیں

(ایضاً ص 107)

دردعلاجِ درد :عام طور پر درد ہوتا ہے یا علاج مگر عشاق طے شدہ پیمانوں کی زد میں کہاں آتے ہیں:

علاجِ درد میں بھی درد کی لذّت پہ مرتا ہوں جو تھے چھالوں میں کانٹے،نوکِ سوزن سے نکالے ہیں

(ایضاً،ص127)

لذتِ خانماں بربادی : گھر بنائے جاتے ہیں سنبھالے جاتے ہیں مگر" ذوالہجرتین" سے ذرا پوچھیے کہ گھربار، بار بار قربان کر دینے میں کیا لذّت ہے:

نہ پوچھو مجھ سے لذت خانماں برباد رہنے کی نشمین سیکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں

(ایضاً،ص712)

قید میں آیا تو حاصل مجھ کو آزادی ہوئی دل کے لُٹ جانے سے میرے گھر کی آبادی ہوئی

(ایضاً،ص146)

علّامہ کی نظمیں" بلال" اور" وصال "(ایضاً،ص106،145) دونوں اسی طرح کے قولِ محال سے معمور ہیں :

بندگانِ خداذوق :رسول پاک ﷺ کی محبت سے جو لوگ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں ان کے اندر بندہ ہوتے ہوئے خدائی رنگ جلوہ گر ہو جاتا ہے :

یہ غازی یہ تیرے پُراَسرار بندے جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی

(ایضاً،ص432)

آشنائی بیگانہ کُن :رسول پاک ﷺ کی محبت دنیا کی تمام محبتوں سے بے گانہ کر دیتی ہے:

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو عجب چیز ہے لذّتِ آشنائی

(ایضاً،ص432)

فنائے ذاتی باعث شورشِ محشر :ذاتی غوغا مٹ گیا مگر تھوڑے ہی وقت بعد وہ شورشِ محشر بن گیا ایسے شرارے بُجھ کر بھی بت کدوں کو نذرِ آتش کر دیتے ہیں یہی شانِ شہداء ہے :

مٹ کے غوغا زندگی کا شورشِ محشر بنا یہ شرارہ بجھ کے آتش خانہ آزر بنا

(ایضاً،ص140)

غنچۂ گلستانِ خزاں منظر :اقبال کہتے ہیں کہ میں تو مسلمان قوم سے بالکل مایوس ہو چکا تھا لیکن فاطمہ بنتِ عبداللہ نے میری رائے بدل دی نہ صرف مسلمان مرد بلکہ اُمّت مِسلمہ کی بیٹیاں بھی مسلمان مردوں سے شہادت میں کسی طرح بھی پیچھے نہیں:

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی ایسی چنگاری بھی یا رب، اپنی خاکستر میں تھی
(ایضاً ص243)

برقِ ابرِ باراں ریختہ :اقبال کہتے ہیں کہ میں تو بالکل نا اُمید ہو چکا تھا مگر فاطمہ جیسی بیٹیاں بھی ابھی اس امتِ مرحوم میں باقی ہیں:

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں!
(ایضاً ص243)

نغمۂ ماتم :شہید کی موت کچھ ایسا ہی رنگ لیے ہوتی ہے :

فاطمہ گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے
(ایضاً ص 243)

مرگِ پیدائی :اقبال کے مطابق دُنیا میں قوموں کے عروج وزوال کی داستان اپنے شُہداء کے حوالے سے کچھ ایسی ہی ہے:

اپنی خاکستر سمندر کو ہے سامانِ وجود مر کے پھر ہوتا ہے پیدا یہ جہانِ پیر، دیکھ
(ایضاً ص296)

یہاں سے اقبال کے قولِ محال میں "العجز فخری" کا رنگ شروع ہو جاتا ہے:

نازِ نیاز مند :جب کوئی کسی محتاج کا محتاج ہونے کے بجائے صرف شانِ صمدیت والے کا محتاج ہوتا ہے تو وہ ایک صاحبِ ناز کا محتاج ہوتا ہے۔اُس میں ایک نازِ نیاز مندی کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔تمام انبیائے کرام اور اولیائے عُظام اسی "العجز فخری" کا نمونہ ہوتے ہیں:

کشادہ دستِ کرم جب وہ بے نیاز کرے نیازمند نہ کیوں عاجزی پہ ناز کرے
(ایضاً ص131)

شُتر بانانِ تمدُّن آفرین :اعرابی "بدّو" تھے،شُتر بان تھے،اُجڈ تھے مگر سرکارِ خاتم النبیین ﷺ کے دامن سے وابستہ ہوئے تو یکسر بدل گئے اور مسلمان تو کیا غیر مسلم بھی Laws((RAOmer's کی باتیں کرنے لگے:

تمدُّن آفریں، خلّاقِ آئینِ جہاں داری وہ صحرائے عرب یعنی شُتر بانوں کا گہوارہ
(ایضاً ص207)

شانِ بندگی برتر از شانِ خداوندی: سرکار ﷺ کے بہت سارے غلام اپنی بندگی میں ایسے ہی مست ہوتے ہیں کہ اُن کو اپنی شانِ بندگی برتر از شانِ خداوندی محسوس ہوتی ہے :

متاع بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی　　مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

(ایضاً،ص352)

بے نیازیِ گدائے مےکدہ : جو شخص" یک در گیر و محکم گیر" کا نسل در نسل پابند چلا آتا ہو اُسے یہ شان نصیب کر دی جاتی ہے:

گدائے مے کدہ کی شانِ بے نیازی دیکھ　　پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو

(ایضاً،ص352)

فقیرِ پرویز وارث : عام طور پر ایسا ممکن نہیں مگر عشق یہ فرق مٹا سکتا ہے:

بچھائی ہے جو کہیں عشق نے بساط اپنی　　کیا ہے اس نے فقیروں کو وارثِ پرویز

(ایضاً،ص354)

گدایانِ کجکلاہ : بظاہر یہ شاعرانہ تعلّی ہے مگر سچ بات بھی یہی ہے:

مرے حلقۂ سخن میں ابھی زیرِ تربیت ہیں　　وہ گدا کہ جانتے ہیں رہ و رسمِ کجکلاہی

(ایضاً،ص377)

درویشیِ خسروانہ : وقت سب پر حاوی ہے مگر فقر زمانے کی روشِ عام کو بدل ڈالتا ہے:

ہوا ہے تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے　　وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خُسروانہ

(ایضاً،ص459)

خوش ترِ ہوش شکر خوابی : فرشتے آدم کی تعریف کے لیے بڑا ارضی اور تغزل والا رنگ اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

جمال اپنا اگر خواب میں بھی تُو دیکھے　　ہزار ہوش سے خوشتر تری شکر خوابی

(ایضاً،ص 460)

ضمیرِ بے پردہ : ضمیر مضمر سے ہے مگر یہاں انسان، نائبِ الٰہی کی حیثیت سے تشریف لا رہا ہے:

تیری ذات سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر　　کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

(ایضاً،ص 460)

مستیِ سبوئے شکستہ : نائبِ حق اپنے مقام کے ادراک اور سبوئے شکستہ سے بھی مست ہو سکتا ہے:

آہ اے جبریل تو واقف نہیں اس راز سے کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سُبو
(ایضاً ص473)

فقیر از سکندر بہتر : سکندر نے پتھر سے آئینہ بنایا تھا مگر اہلِ فقر انسان کو حیوان سے انسان بنا دیتے ہیں۔ یہ انسان ساز ہوتے ہیں اور انسان کے اندر دِل بھی ہوتا ہے جو کئی آئینوں پر بھاری ہوتا ہے:

مرا فقر بہتر ہے اسکندری سے یہ آدم گری ہے، وہ آئینہ سازی
(ایضاً ص476)

خاکی خاک آزاد : مردِ مومن کسی خاص مٹی کا باسی نہیں ہوتا:

افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن
(ایضاً ص558)

کُلاہ داریِ بے کُلاہ : برطانوی ہند کا نوجوان غلام مسلمان خستہ ہے شکستہ خاطر نہیں۔ یہ بدحال نظر آتا ہے بدکردار نہیں۔ یہی دراصل مسلمان کا اصل رنگ ہے:

نگاہِ کم سے نہ دیکھ اس کی بے کلاہی کو یہ بے کلاہ ہے سرمایہ کلہ داری
(ایضاً ص683)

یہاں سے اقبال کے اقوالِ محال میں جنونِ باشعور کا آغاز ہوتا ہے۔

عقلِ نافہم : عقل کا کام فہم و ادراک ہے مگر یہ اپنے ظن و تخمین میں کھوئی رہتی ہے اس لئے اکثر پیچھے رہ جاتی ہے اور عشق معرکہ سر کر لیتا ہے:

عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گامِ عمل عقل سمجھی ہی نہیں معنیِ پیغام ابھی
(ایضاً ص311)

جنونِ باشعور : رسولِ پاک ﷺ کے اکثر غلام اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے:

اک جنوں ہے کہ با شعور بھی ہے اک جنوں ہے کہ با شعور نہیں
(ایضاً ص 376)

جنون، صاحبِ ادراک : جنون صاحبِ ادراک بھی ہو سکتا ہے:

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک

(ایضاً ص394)

جنونِ خرد استاد : عقل ایک جیسی چیزوں میں اختلاف تلاش کر لیتی ہے۔عشق مختلف چیزوں میں یکسانیت تلاش کر دیتا ہے جو خرد کا بھی اُستاد بن جاتا ہے لیکن وہ عشق اور وہ جنون مسلمانوں میں ختم ہو چکے ہیں:

تیرے دشت و در میں مجھ کو وہ جنوں نظر نہ آیا کہ سکھا سکے خرد کو رہ و رسم کارسازی

(ایضاً ص587)

جنونِ چاک دوز : جنون عام طور پر چاکِ گریبان کا سبب ہے مگر کبھی کبھی یہ چاک سینے کا کام بھی کرتا ہے :

ایسا جنوں بھی دیکھا ہے میں نے جس نے سیے ہیں تقدیر کے چاک

(ایضاً ص625)

جنونِ روشن ادراک : جنون عقل کو ماؤف کر دیتا ہے مگر یہ بعض وقت روشن ادراک بھی ثابت ہوتا ہے:

رکھتا ہے اب تک میخانۂ شرق وہ مے کہ جس سے روشن ہوا دراک

(ایضاً ص625)

تدبیر اہلِ جنوں : جنون تدبیر ساز بھی ہو سکتا ہے:

حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے ورائے عقل ہیں اہلِ جنوں کی تدبیریں

(ایضاً ص747)

یہاں سے اقبال کے قولِ محال میں مسلمانوں میں فقرِ غیّور اور جنونِ باشعور کے ختم ہو جانے کا گِلہ بلکہ نوحہ شروع ہوتا ہے۔

ساقیِ بے صہبا : مسلمان راہنماؤں کا انداز اب کچھ ایسا ہی ہے:

سوچ تُو دل میں لقب ساقی کا ہے زیبا تجھے؟ انجمن پیاسی ہے اور پیمانہ بے صہبا ترا

(ایضاً ص 212)

اب "مومن سودائی بُت خانہ" ہو چُکا ہے:

کعبہ پہلو میں ہے اور سودائی بُت خانہ ہے کسی قدر شوریدہ سر ہے شوقِ بے پروا ترا

(ایضاً ص 212)

برق دامانِ خرمن آسودہ : برق تو خرمن سوز ہوتی ہے لیکن مسلمان اپنے اسلاف کی میراث جہاد سے بالکل خالی ہو

چکے ہیں۔علّامہ کا یہ محبوب موضوع ہے جسے علّامہ نے بار بار مختلف انداز میں دہرایا ہے۔" جوابِ شکوہ" (ایضاً ص 227) اور" بُڈھے بلوچ کی نصیحت" (ایضاً ص 713) میں اسی دل سوزی کا بیان ہے اور آج کل غزہ میں جو کچھ ہو رہا ہے اُس سے پتہ چلتا ہے کہ علّامہ کتنے سچے تھے:

وسعتِ گردوں میں تھی اِن کی تڑپ نظّارہ سوز بجلیاں آسودۂ دامانِ خرمن ہو گئیں

(ایضاً ص 215)

اُمتی باعثِ رُسوائی پیغمبر ﷺ : علّامہ کے بقول اب تو :

امتی باعثِ رسوائی پیغمبرؐ ہیں بت شکن اٹھ گئے باقی جو رہے بت گر ہیں

تھا براہیم پدر اور پسر آزر ہیں

(ایضاً ص 229)

علّامہ دوبارہ کہتے ہیں:

بجلیاں جس میں ہوں آسودہ، وہ خرمن تم ہو بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن، تم ہو

(ایضاً ص 229)

شیخ صنم تراش : انسان اور کیمرے کی آنکھ میں یہی فرق ہوتا ہے مگر یہاں ہندوستان میں یہی صورت ہے:

پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا ہے شیخ بھی مثالِ برہمن صنم تراش

(ایضاً ص 275)

میراثِ خلیل رُبا فرزندانِ تثلیث : آج کل خاکِ حجاز خشتِ کلیسا ساز بن چکی ہے۔آج اسرائیل غزہ میں نسل کُشی کر رہا ہے اور ستاون مسلم ممالک فقط تماشائی بنے ہوئے ہیں اور علّامہ کے بقول :

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

(ایضاً ص 293)

تیرِ بے ہدف کشیدہ : ہدف پہلے ہوتا ہے تیر بعد میں کھینچا جاتا ہے مگر کچھ رسمی مسلمان مجاہد ایسے بھی ہوتے ہیں کہ:

میر سپاہ نا سزا، لشکریاں شکستہ صف آہ وہ تیرِ نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف

(ایضاً ص 373)

سومناتِ اہلِ حرم : لات و منات و سومنات کو ماننے والے آج بڑے خوش ہو کر جی رہے ہیں جب کہ پہلے سومناتِ اہلِ کفر

ہوا کرتے تھے اب سومناتِ اہلِ حرم کے لیے اقبال کسی غزنوی کو آواز دے رہے ہیں:

کیا نہیں اور غزنوی کا رگِ حیات میں　　بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہلِ حرم کے سومنات

(ایضاً ص 439)

بے حُسینؑ قافلۂ حجاز : یزید کی اولادِ معنوی تو اس کی ہر روز سال گرہ منائے مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے جو غزہ، کشمیر اور گجرات (بھارت) میں نظر آرہا ہے:

قافلۂ حجاز میں ایک حُسینؑ بھی نہیں　　گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

(ایضاً ص 439)

پیرِ حرم رُسوا کُن حرم : پیرِ حرم عموماً حرم کی عزت افزائی کا باعث ہوتا ہے مگر آج کا پیرِ حرم اپنی کم نگاہی سے حرم کی رُسوائی کا سبب بن چکا ہے:

حرم رُسوا ہوا پیرِ حرم کی کم نگاہی سے　　جوانانِ تتاری کس قدر صاحبِ نظر نکلے

(ایضاً ص 303)

مُسلمِ زُنار پوش : ہندوستان کا مسلمان، مسلمان ہے مگر دل کا پورا ہندوستانی ہے کیونکہ جب مذہب اور ثقافت میں جنگ ہوتی ہے تو ثقافت جیت جاتی ہے:

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش　　مگر دل ابھی تک ہے زُنار پوش

(ایضاً ص 439)

شیخِ کلیسا نواز : شیخ تو خانقاہ نواز ہوتا ہے مگر آج کا شیخ مدرسہ، مسجد اور خانقاہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا:

ہم پوچھتے ہیں شیخِ کلیسا نواز سے　　مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر

(ایضاً ص 541)

راہبی گُناہ ترسندہ : ایسے ترکِ علائق کا کیا فائدہ:

اگرچہ پاک ہے طینت میں راہبی اس کی　　ترس رہی ہے مگر لذت گنہ کے لیے

(ایضاً ص 597)

سازِ بیگانۂ مضراب : ساز دیوانۂ مضراب ہوتا ہے مگر ملتِ مسلمہ کے ساز کی موجودہ کیفیت یہ ہے:

جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں　　محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب

(ایضاً،ص621)

شعلۂ نم خوردہ : موجودہ خانقاہی نظام اور اس پہ قابض پیرانِ نان ونمک کی اپنی ذات میں کوئی انقلاب نہیں یہ کسی قوم میں کیا تبدیلی لائیں گے:

ممکن نہیں تخلیق خودی خانقہوں سے　　اس شعلۂ نم خوردہ سے ٹوٹے گا شرر گیا

(ایضاً،ص686)

اعتبارِلات ومناتِ اہلِ حرم : لات ومنات پر اہلِ کفر کا اعتبار ہوتا ہے مگر صد افسوس کہ آج کا مسلمان اہلِ کفر سے بھی زیادہ صنم پرست ہو چکا ہے :

وہی حرم ہے وہی اعتبا رِلات و منات　　خدا نصیب کرے تجھ کو ضربتِ کاری

(ایضاً،ص690)

لات ومنات اِلٰہیات: لات ومنات تو صنم پرستی کی علامت تھے :

کیا مسلما ں کے لیے کا فی نہیں اس دور میں　　یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات؟

(ایضاً،ص711)

نمازیِ صنم آشنا : یہ مسلمان تو نمازیِ صنم آشنا ہے ۔اب اگر خُدا رنگِ مجاز میں آ بھی گیا تو وہ جلوہ خُدا ہی کا ہو گا۔ وہ صنم کے روپ میں آنے سے تو رہا:

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا　　ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کہا ملے گا نماز میں

(ایضاً،ص 313)

تجلّائے مستور : پتا نہیں یہ کیسے ظاہر بیں عارف ہیں:

حکیم و عارف و صوفی تمام مستِ ظہور　　کسے خبر کہ تجلّا ہے عین مستوری

(ایضاً،ص375)

آبِ آتش ناک : علّامہ دُعا کرتے ہیں کہ" اے اللہ پاک! ہمارے اساتذہ اور طالب علموں کو مئے یقین اور سوز عطا کر دے ۔":

مئے یقیں سے ضمیرِ حیات ہے پُر سوز　　نصیب مدرسہ یا رب یہ آبِ آتش ناک

(ایضاً،ص394)

حرمِ بے فیض : مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتدریس کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ :

دگر بمدرسه هائ حرم نمی بینم　　دلِ جنید و نگاہِ غزالی و رازی

(ایضاً،ص748)

عجم ہُنوز عجم :اس شعر میں علاّمہ فرماتے ہیں ایک شخص ہے احمد ہے، حُسین ہے، مدنی ہے اور فاضل دارالعلومِ دیوبند بھی ہے مگر جو بات کرتا ہے وہ رسولِ پاک ﷺ کی منشا کے برعکس ہے تو وہ اپنی عمر کے آخری حصہ میں بھی "عجم" ہے۔ علم اور نسبتوں سے ذرا فرق نہیں پڑا :

عجم هنو زنداند رموزِ دین، ورنه　　زدیو بند حسین احمد! این چه بو العجبی است

سرود بر سرِ منبر که ملت از وطن است　　چه بی خبر ز مقامِ محمدِ عربی ﷺ است

بمصطفی برسان خویش راکه دین همه اوست　　اگر به او نرسیدی، تمام بولهبی است

(ایضاً،ص754)

کلیمِ ہلاکِ سامری، خلیل شیوۂ آزری :علاّمہ اقبال ذرا انداز بدل کر اُسی گلے کو تازہ کرتے ہیں اور وہی نشترِ طنز ہے کبھی قاری کی گردن ہے کبھی اپنی گردن ہے:

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا　　میں ہلاکِ جادوئے سامری، تو قتیل شیوۂ آزری

(ایضاً،ص280)

یہ شعر ایک مسلسل قولِ محال ہے جس میں علاّمہ کہتے ہیں کہ میرا عیش غم میں، شہد سم میں اور بود عدم میں بدل چکا ہے لیکن تیرے دل کا حال بھی پہلے جیسا کب ہے:

مرا عیش غم، مرا شہد سم، مری بود ہم نفس عِدم　　ترا دل حرم، گروِ عجم، ترا دیں خریدۂ کافری

(ایضاً،ص280)

گلۂ جفائے وفا نما : آج کے مسلمان کو تو اس کا اپنا حرم بھی قبول کرنے سے ڈرتا ہے اور اسے اس مسلمان سے گلۂ جفائے وفا نما ہے:

گلۂ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہلِ حرم سے ہے　　کسی بت کدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

(ایضاً،ص 280)

گدائے سکندر دماغ :بالآخر یہ مسلمان پھر سے رسولِ پاک ﷺ کے دامن کرم گُستر کی طرف رجوع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم تو آپ ﷺ کے وہی گدایانِ سکندر دماغ ہیں۔ ذرا پھر سے کرم کر دیجیے:

کرم اے شہ عرب و عجمؐ کہ کھڑے ہیں منتظرِ کرم　　وہ گدا کہ تُو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغِ سکندری

(ایضاً،ص280)

اقبال کے اکثر اقوالِ محال طنزیہ نشتر ہیں ۔جب طویل بخار سے منہ کا ذایقہ خراب ہو جاتا ہے تو طبیب ایک پھل کھانے کا مشورہ دیتے ہیں جو ذایقہ میں کڑوا ہوتا ہے پر نام اس کا ”میٹھا“ ہوتا ہے جو بگڑے ہوئے مزاج کو درست کر کے منہ کا ذایقہ ٹھیک کر دیتا ہے اقبال کے یہ فارسی آمیز اقوال محال ہیں اقبال کی یہی فارسی آمیزی دراصل فارسی آموزی کی ایک کوشش ہے جو ارسالِ خدمت ہے۔

گرے رنگ کوئی رنگ نہیں ہوتا بلکہ جہاں دو بنیادی رنگ آپس میں ملتے ہیں اُس خیالی خطِ اتصال کو گرے کہہ لیتے ہیں اسی طرح سرِشام دن کے ختم اور رات کے شروع ہونے سے پہلے کا وقت ہے مگر یہ کوئی خاص وقت نہیں ہوتا ادب کی دنیا میں زندگی کی دو متضاد مگر یکجا اور بیک وقت سچی کیفیات کو قولِ محال کہتے ہیں ۔ یہاں اقبال کے چند اقوالِ محال کی صرف ایک ہلکی سی جھلک پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن قولِ محال کے لحاظ سے اقبال کے سارے اوراق کی تحقیق (کلیاتِ اقبال (اردو)،باقیاتِ اقبال (اردو)،اقبال کا ابتدائی کلام،کلیاتِ اقبال (فارسی)، مکتوباتِ اقبال،اقبال کے انگریزی اور اردو خطبات وغیرہما) بڑی مفید اور دل چسپ ہوگی۔لکھ دیا جو لکھ سکتا تھا نہ لکھ سکا جو لکھنا چاہتا تھا۔

کتابیات

۱۔القرآن الحکیم۔

۲۔اقبال،محمّد ،علاّمہ، 2007(بارِہشتم)”کلیاتِ اقبال اردو“ پاکستان،لاہور،اقبال اکادمی پاکستان۔

۳۔نوید احمد گل،ڈاکٹر،پروفیسر،2022،اقبال : ”خاموشی گفتگو ہے“۔مضمونِ مشمولہ” پیغام آشنا“ ،مدیر علی کمیل قزلباش،پاکستان،اسلام آباد، ثقافتی قونصلیٹ سفارتِ اسلامی جمہوریہ ایران،ج22،شمارہ نمبر89،صص 20-9۔

***

علامہ محمد اقبال سے فارسی گو شعرائے پاکستان کا اظہارِ عقیدت

(حصہ اول)

* ڈاکٹر مسرت واجد * ڈاکٹر عصمت درانی ** ڈاکٹر مصطفی حیدر زیدی

A Tribute to Allama Muhammad Iqbal, by Persian Poets Of Pakistan(Part: 1st)

Prof.Dr.Musarrat Wajid/ Dr. Ismat Durrani/ Dr.Mustafa Haider Zaidi

Our national poet, Allama Dr. Muhammad Iqbal is such a great and well known personality. He woke up the muslims of sub-continent, from their deep sleep by his speeches and urdu&persian poetry. Unfortunately! In 1938, Iqbal died. At that crucial time so many leaders of muslims appreciated&admired his struggle and contribution. At that time, after a while, all poetic persons also appreciated and admired him by their all type of poetry&his Personality.They are till date inspiring the words of Iqbal and his passionate poetry is admired at occasions like his death anniversary, Pakistan day and other important days in the country and worldwide.

With National language like urdu and local languages like saraiki, punjabi, sindhi and pashto etc, poets express their feelings in persian language too. In this article author tried to write about the short life history of a few of the Pakistani poets who admired the poetry of Iqbal through their poetry

Key words: Iqbal,pakisatan,persian poetry,appreciation&tribute to Allama Iqbal

* پروفیسر شعبہ فارسی اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور ** پروفیسر شعبہ فارسی اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور

علامہ ڈاکٹر محمد اقبال ہمارے قومی شاعر ہیں۔آپ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو؛ شیخ نور محمد کے گھر پیدا ہوئے۔اور بہت سے مراحل کے بعد، شاعر مشرق، حکیم الامت علامہ محمد اقبال کہلائے۔آپ نے برصغیر کے مسلمانوں کو، نہ صرف ایک الگ ملّت کا تصوّر دیا، بلکہ اپنی شاعری اور افکار کے زریعے، انہیں خواب غفلت سے جھنجوڑ کر جگایا۔آخرکار، اسی جدّ و جہد کے دوران ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو مالک حقیقی سے جاملے۔تو برصغیر پاک و ہند کے ادبا و شعراء کرام کی روش رہی ہے کہ وہ اقبال کے جنم دن پر اپنی مختلف زبانوں میں، خوشیوں کے گیت گاتے ہیں اور یوم وفات پر سوگ مناتے ہیں۔لیکن دونوں مواقع پر، اپنے اپنے انداز میں عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ہر زبان کے شعرا، نے نظموں، مثنویوں، مرثیوں اور دیگر اصناف سخن کے ذریعے، ان کے، قد آور ہونے، کا اعتراف کیا اور مقام و مرتبہ کو پہچانا۔بہت سے اخبارات و مجلات اقبال نمبر نکالتے رہے اور اب تک بھی یہ روش باقی ہے۔اور نثر و نظم؛ دونوں انداز میں داد و تحسین پیش کیا جاتا ہے۔اور یہ سلسلہ آج بھی اسی عقیدت و محبت سے جاری ہے۔اور مقامی زبانیں، سرائیکی و پنجابی اور قومی زبان اردو کے ساتھ ساتھ، فارسی زبان میں بھی شعرائے پاکستان، اقبال سے اپنی محبت اور وابستگی کا اظہار کرتے ہیں۔اور اس تحقیقی مضمون کا موضوع بھی فارسی زبان ہی ہے۔یعنی فارسی زبان میں اقبال سے عقیدت کا اظہار کیا جانے والا کلام شامل مضمون ہے۔اس مختصر مضمون میں اتنی گنجائش نہیں کہ تمام شعرا، کا کلام جمع کیا جاسکے۔اس لئے چند فارسی گو شعرا کے کلام پر اکتفا کیا جارہا ہے۔آگے بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

اس سے قبل راقم کا ایک مضمون بہ عنوان'' جنوبی پنجاب کے فارسی گو شعرا، کا اقبال کو خراجِ تحسین'' شائع ہو چکا ہے جس میں جنوبی پنجاب پاکستان سے، اختر علی منیر، اسلم انصاری، اللہ نواز کھتران، جلال الدین، لبید بہاول پوری، عبدالقادر جوہر، مولوی غلام حسین، وغیرہ کو شامل مضمون کیا گیا تھا۔(رک مجلّہ **پیغام آشنا (سہ ماہی)**، جلد ۱۹، شمارہ ۷۳:، سال ۲۰۱۸، صص ۳۳:۔۳۹) اور اقبال کو، جنوبی پنجاب کے دیگر فارسی گو شعرا کا خراج تحسین، پر ایک مضمون جلد چھپنے کے مراحل میں ہے۔لیکن اس مضمون میں بھی پاکستان کے فارسی گو شعرا میں سے، ڈاکٹر رضیہ اکبر، اور نیلما درانی؛ جنوبی پنجاب پاکستان کی نمائندگی کے لئے شامل کیا گیا ہے۔

البتہ اس مضمون میں کوشش کی گئی ہے کہ پاکستان کے دیگر شہروں سے وابستہ؛ چند اور فارسی گو شعراء کا تعارف اور اقبال سے محبت وعقیدت پر مبنی اشعار، قارئین کی دیدہ ہائے بینا کو، اور بھی طراوت بخشیں۔اس مضمون میں موجود، فارسی گو شعرا کے تعارف میں، الفبائی ترتیب کا اہتمام کیا گیا ہے۔

جعفری، مقصود :(پیدائش ۱۹۴۷ء:) سیّد مقصود جعفری کشمیر کے ضلع پونچھ، اس وقت کے مشہور شاعر؛ اور'' ہفت روزہ کشمیر'' کے چیف ایڈیٹر؛ تحسین جعفری کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم اپنے آبائی شہر سے ہے۔ میٹرک سے ایم۔اے انگلش تک؛ تعلیمی سلسلہ راولپنڈی میں مکمل ہوا۔ اس کے فوراً بعد گارڈن کالج راولپنڈی ہی سے درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا؛ جو کہ ۱۹۹۱ء تک جاری رہا۔ پھر سیاسی اور انتظامی امور میں مصروف ہو گئے۔

شاعری مقصود جعفری کو ،وراثت میں ملی تھی، اس تعلق نے شاعری کو ،جلاء بخشنے میں مؤثر کردار ادا کیا۔ آپ اردو، انگریزی، پنجابی، اور کشمیری میں شعر کہتے ہیں۔ آپ کے فارسی زبان میں چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں

۱:۔ بادۂ نو، ۱۹۷۲ء۔ ۲۔ حلقۂ زنجیر، ۱۹۸۹ء۔ ۳۔ آتش غزل، ۱۹۹۹ء۔

۴۔ جامِ وفا، ۲۰۰۱ء۔ ۵۔ آوازِ عصر (اردو، فارسی مجموعہ) (احمد، ظہور الدّین، ۲۰۰۵ء، ص ۲۷۲) و (پیغام آشنا، شمارہ ۶۶: ۲۰۱۶ء، ص ۸۵: ۔ ۹۳)

جہاں مقصود جعفری نے زندگی کے موضوعات پر قلم اٹھایا، وہاں اپنے قومی شاعر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے اور اقبال سے، بہ عنوان'' بہ فیضِ اقبالؒ ''عقیدت و مودّت کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

سفالین جامِ خود را ،من حریفِ جامِ جم کردم — سرورِ می پرستی را، ز سوزِ عشق کم کردم
منم شاهین صفت دل خواهشِ پرواز می دارد — گذشت آن روزهای غم که دل را، واقفِ غم کردم
جوانان را پیامِ آگهی دادم ولی هر شب — برای عظمتِ ملّت چراغِ چشم نم کردم
غزل را سوز و سازِ حضرتِ اقبال داده ام — به فیضِ فکرِ درویشان برین دنیا کرم کردم
رُموزِ دین و دنیا را، به فیضش فاش می گویم — دلم پائنده خواهد شد چون من ترکِ صنم کردم
شکستم رسمِ میخواری به ضربِ خوش نوایی ی دل — ز خود داری خودی را، جعفری من تازه کردم

(مجلہ سروش، اپریل ۱۹۸۰ء، ص ۲:)

حزیں، امین :(۱۴ اگست/ ۱۸۸۸ء۔ ۱۴ اگست/ ۱۹۶۸ء) امین حزیں شہر اقبال سیالکوٹ میں پیدا ہوئے، اس وجہ سے سیالکوٹی بھی کہلاتے تھے۔ ان کا اصل نام محمد مسیح تھا۔ امین حزیں تخلص کرتے تھے۔ لیکن کشمیر کے قبیلہ پال سے تعلق کی وجہ سے نام کے ساتھ پال بھی لگاتے تھے۔ ان کے والد مولوی احمد دین پال؛ متقی انسان تھے۔ حزیں نے عربی، فارسی کی تعلیم استاد اقبال؛ شمس العماء مولوی میر حسن سے حاصل کی۔ ابتدائی تعلیم سے بی۔اے تک سیالکوٹ

ہی سے تعلیمی سلسلہ جاری رکھا۔گورنمنٹ آف انڈیا کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں ملازم ہو گئے ۔ ۱۹۴۵ء میں قائداعظم محمد علی جناح کے حکم پر ''صاحب بہادر'' کا خطاب ملا۔ملک وملت کی خدمت کرتے ہوئے،اس دنیا کو،الوداع کہا۔

امین حزین ؛اردو،فارسی،عربی،انگریزی،پنجابی،پشتو،چترالی اور گلگت وغیرہ جیسی زبانوں پر مہارت رکھتے تھے۔ان کا کلام ملک کے مختلف رسائل وجرائد میں چھپتا رہتا تھا۔ان کے شعری مجموعے'' گلبانگ حیات''۱۹۴۵ءمیں اور''اوراقِ گل'' شائع ہو گئے ۔(تاریخ ادبیات مسلمانان،پاکستان و ہند،فروری ۱۹۷۲ء،جلد: پنجم،ص ۶۶۴:)اوران کا فارسی کلام'' نوای دل'' کے نام سے،ان کے فرزند؛محمد سعید پال نے مرتب کر کے شائع کیا۔(احمد،ظہورالدّین،۲۰۰۵ء،پاکستان میں فارسی ادب،ص ۳۹:)اس کلیات کا انتساب علامہ اقبال کے نام کیا ہے۔ان کی اقبال سے عقیدت ومحبت کا اظہار اگرچہ بہت ملتا ہے چاہے وہ اقبال کے کلام کی تقلید کی صورت میں ہو یا پھر مستقیم اقبال کو مخاطب کر کے عقیدت اظہار کیا ہو۔درج ذیل اشعار میں حزین،نے اقبال سے والہانہ عقیدت کا اظہار کیا ہے،فرماتے ہیں:

اندرونِ سینه ها ،دل گرم شُد　　وز تُو ،این افسرده محفلِ گرم شُد
سرکشیدی ناله ها،از ساز و سوز　　نکته هاگفتی ز اسرار و رُموز
ساختیم و ماسوا را،سوختیم　　نعرۀ یاهو،ز تُو آموختیم
بی خودی، در جامِ تو بشناختیم　　خویش را، اندر خودی دریافتیم

(احمد،ظہورالدّین،۲۰۰۵ء،پاکستان میں فارسی ادب،ص ۴۰:)

خلوت،غلام محی الدّین ،پروفیسر: (پیدائش ۱۸۹۶ء: ۔) آپ میاں فیروز الدّین کے بیٹے ہیں اور شہر لاہور میں پیدا ہوئے ۔جوکہ گورنمنٹ کالجوں میں اردو،فارسی کے استاد رہے ۔ریٹائر ہونے کے بعد،اسلامیہ کالج آف کامرس لاہور کے پرنسپل بھی رہے ۔وہ اردو اور فارسی ،دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے ۔نعت سرورِکونین آپ کا مرغوب موضوع تھا۔وطن عزیز سے محبت کا اظہار کرتے رہتے ۔ایک دفعہ قائداعظم محمد علی جناح سے مخاطب ہوکر فرماتے ہیں:

دمیدی روحِ تازه ،در تنِ ما ،قائدِ اعظم!　　حیاتِ جاودان را،ضامن است این شاهکارِ تو!

(تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند،ج،پنجم: صص ۶۷۱: ۔ ۶۷۲)

درج ذیل اشعار میں اقبال کو، نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔

ای حکیمِ اُمّتِ ما، شاعرِ فطرت شناس　　یادِ تو قلبِ حزین را، مایۀ صبرو سکون

از تو گشتیم، آشنای وحدتِ عزم و یقین
عشقِ ملّت را، رساندی تو، به سرحدِّ جنون

از کلامِ حرّیت آموز پیغامِ خودی
طرحِ نو لاریب افگندی، به اقلیمِ سخن

هیبتِ افرنگ طاری کرد، گو برما سکوت
نعرۂ مستانۂ تو، آمده افسون شکن

ای که کردی قوم را، سرشارِ صهبای یقین
ساختی روشن دِل ما، از شرارِ آرزو

زندۂ جاویدهستی تُو، به فیضِ عشق خویش
بر زبانِ ما روان است، قُدّسِ حق سِرّهٗ

(بحضور اقبال، جون ۱۹۷۷ء، ص ۵۷:)

رضیہ اکبر، ڈاکٹر : (پیدائش ۱۹۵۴ :ء) ڈاکٹر رضیہ اکبر، پشاور میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے والد ایک آرمی آفسر تھے۔ اس لئے آپ کی ابتدائی تعلیم آرمی پبلک سکول سے مکمل ہوئی۔ آپ کے والد نے، حکومت پاکستان کی طرف سے، ایران میں بھی خدمات سرانجام دیں۔ اس دوران نے، میٹرک تک ایران ہی میں تعلیم حاصل کی اور بعد میں اسلام آباد کالج سے، ایف۔اے، بی۔اے، کیا۔ پھر ایم۔اے فارسی نَمل یونیورسٹی NUML (نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز) ؛ جو اس وقت نَمل NIML یعنی نیشنل انسٹیٹوٹ آف ماڈرن لینگویجز تھا، سے مکمل کیا اور اسی یونیورسٹی ہی میں، درس و تدریس کا شغل اختیار کرتے ہوئے، تاریٹائرمنٹ، اسی ادارے سے وابستہ رہیں۔ آپ فارسی بہت خوب صورت لب و لہجے میں بولتی ہیں۔ آپ کی شادی آپ کے چچازاد سے ہوئی، جو کہ پیشے کے لحاظ سے آرمی سے وابستہ تھے۔ آپ کے سسر بھی آرمی آفیسر تھے۔ آپ کے دو بیٹے ہیں۔ آپ کے شوہر ۱۹۹۷ء میں شہید ہو گئے۔ شوہر کی شہادت ہی، ان کی شاعری کا محرک ٹھہری۔ اور انہوں نے اسے اپنے شوہر سے محبت اور ان کے جانے کے بعد مسائل کو سہنے کا سہارا بنایا۔ آپ کا فارسی کلام فصل نامہ دانش، مرکز تحقیقات ایران و پاکستان، اسلام میں چھپتا رہا ہے۔ آپ کا شعری مجموعہ؛ ''سبوی شکستہ''، ایران سے چھپا ہے۔ آپ نمل یونیورسٹی اسلام آباد میں، شعبہ فارسی میں بحیثیت ایسوسی ایٹ پروفیسر، فرائض سر انجام دیتی رہی ہیں اور اب ریٹائرمنٹ کے بعد بھی شعبہ میں تحقیقی اور تدریسی خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔ ضمناً بتاتی چلوں کہ ڈاکٹر رضیہ اکبر صاحبہ کے آباء پشاور سے ملتان کی طرف ہجرت کر کے آئے۔ ان کے دھدیال اور موروثی زمینیں بھی ملتان میں موجود ہیں۔

(انٹرویو، از ڈاکٹر رضیہ اکبر، مارچ ۲۰۲۱ء، بہ ذریعہ ٹیلی فون، واٹس ایپ)

(ر۔ک: پیغام آشنا، شمارہ ۸۸: ص ۸: ۔ ۲۸)

ڈاکٹر رضیہ اکبر صاحبہ نے خراج عقیدت بہ حضور اقبال، بہ عنوان ''اقبال روشن فکر''، پیش کیا ہے، فرماتی ہیں:

اقبال روشن فکر و روشن خیال ما — فکر صالح اوست بال ما
او که عصای لااِله داشت به دست — هر طلسم خوف را، باآن شکست
غافل از خودی خود یک دم نبود — ریزهٔ الماس بود شبنم نبود
زندگیش بر جای خود بالیدن بود — از خیابان خودی گُل چیدن بود
او هیچ گاه ترس از مرگ نداشت — چون مرگ آمد تبسم بر لب داشت
آن نغمه سرا با ساز و سخن دلربا — سوی قطار کشید ناقهٔ بی زمام را
اقبال از قید مرز بوم آزاد بود — نه افغان و نه ترک و تتار بود

(دانش، شمارہ ۸۴۔۸۵/۲۰۰۶، ص ۲۳۹:)

شفا، یحییٰ، محمد خان، حکیم : (سال پیدائش و وفات معلوم نشد) شفا خانپوری، خطۂ پوٹھوار کے موضع: خانپور سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ بالغ نظر سیرت نگار، ماہر طبیب اور فن عروض پر دسترس رکھتے تھے۔ حکیم محمد یحییٰ خان شفا، راولپنڈی میں امام باڑے کے نزدیک مقیم رہے۔ شاعری میں ان کے معروف شاگردوں میں پاکستان کے معروف شاعر، قتیل شفائی سرِفہرست ہیں۔ شفا صاحب سے شاعری میں اصلاح لینے اور استاد سے خاص محبت و عقیدت کے اظہار کے لئے شفائی تخلص اپنایا اور شہرت دوام حاصل کی (ریختہ ادب، گروپ، فیس بک) حکیم محمد یحییٰ خان شفا، نے اقبال کو بہ عنوان ''یاد بود اقبال'' خراجِ عقیدت پیش کیا، فرماتے ہیں:

ای که در باغِ جهان سروقد بالاستی — رونقِ صحنِ چمن باشی بهار افزاستی
اکتسابِ نور و نکهت می کند هم باختر — تو که در خاور زمین یک جلوهٔ آراستی
فکرت روشن هویدا کرد دنیای نوی — دانشِ تکوین که پنهان بودتو پیداستی
نطشی ار می نمایاند ترا فوق البشر — پاسخش دادی که تو آن مومن یکتاستی
کز وجودش زندگی هر لحظه می گیرد فروغ — آدم وهم آدمیت را، شباب افزاستیادی
اهل مشرق را، چو درسِ عرفانِ خودی — اهلِ مغرب را ،بدینگونه وقار افزاستی
سوزِ عشقت پردهٔ ساز نوای زندگی — از ره اشعار پندارم اثر فرماستی
میهن پاک آشکارا، می کند جذب ترا — از میان رفتی و ذوقِ جذبهٔ کاستی

این کہ می بینم بہ بیداری است یارب یا بخواب　　بعد مردن ہم باین مجلس سخن آراستی

(مجلہ سروش، دسمبر ۱۹۷۷ء، ص ۳۷:)

ضیاء، ضیاء محمد: (پیدائش ۱۲: فروری ۱۹۲۸ء) ضیاء قصبہ کنجاہ؛ ضلع گجرات کے ایک گاؤں؛ چوھامل میں، علاقے کے ایک معزز شخصیت حکیم عبدالرسول قریشی کے گھر پیدا ہوئے۔ اصل نام ضیاء محمد تھا اور ضیاء ہی تخلص کرتے تھے۔ ابتدائی تعلیم گجرات سے حاصل کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی لاہور سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا اور فارسی زبان و ادب کی تدریس میں مصروف ہو گئے۔ ۱۹۸۷ء میں گورنمنٹ ہائی سکول پسرور میں کُل وقتی استاد کے طور پر تقرری ہوئی۔

مجموعہ ہای شعر ضیاء:

۱۔ نغمۂ عشق (نعتیہ شاعری) ۱۹۷۵ء۔

۲۔ کاروانِ فارسی (نظموں پر مشتمل) ۱۹۷۵ء۔

۳۔ نوای شوق (قصائد، غزلیات، مثنویات، قطعات، ترانہ ہای، مادۂ تاریخ ہا، متفرقات، دوبیتی اور مفردات پر، مشتمل ہے) ۱۹۷۷ء ضیاء، اقبال سے بہت متاثر تھے۔ اور مختلف مواقع پر، اقبال سے عقیدت کا اظہار کیا۔

۔(احمد، ظہورالدین، فارسی ادب میں فارسی ادب، جلد ششم، ۲۰۰۵ء، ص ۲۵۵: ۔ ۲۵۸) انہوں نے ''نوای شوق'' میں منظومہ بہ عنوان: ''اقبال'' اور بہ عنوان: ''بنیاد اقبال'' میں دوبیتیوں میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

ای شاعر خوش بیان ملت　　ای مایۂ فخر وشان ملت

ای نیّر آسمان اسلام　　ای بُلبُل بوستان ملّت

در فکر وطن بسی طپیدی　　جان در تن مردگان دمیدی

طرحی ز جهان نو فکندی　　یک عالم تازه آفریدی

ملّت ز نوای تو جوان شد　　صحرا ز دم تو گُلستان

ز آواز درای تو هجومی　　سر گرم سفرچو کاروان شد

گیرم حرارت از پیامت　　داریم چو جان عزیز نامت

از دهر اگرچه بُرده ای رخت　　زنده است پیام جاودانت

(ضیاء، ضیاء محمد، نوای شوق، ۱۹۷۷ء، ص ۱۰۲ اور ۱۷۹)

ظہورالحق ظہور، حافظ: (پیدائش ۱۴: اپریل ر ۱۹۲۳ء) ضلع کیمبل پور کی تحصیل فتح جنگ کے گاؤں جھنڈیال میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مولانا غلام محمد صاحب علم و فضل انسان تھے۔ ظہور کو بچپن ہی سے بہت علمی ماحول میسر آیا جس میں انہیں ابتدا ہی سے عربی، فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا اور فارسی کے ساتھ خاص شغف کی وجہ سے ظہور نے خانۂ فرھنگ ایران سے کئی فارسی کورس بھی کئے اور دو مرتبہ ایران جانے کا موقع بھی پایا، جس اے جدید فارسی کا لب و لہجہ بھی کمال مہارت سے سیکھا۔ وہ اردو کے ساتھ فارسی کے بہت باہنر شاعر تھے۔

مجلہ سروش، ژانویہ ۱۹۸۱ء، ص ۱۲:

(http//www.naatkainaat.org)

فارسی میں ان کی شاعری، کلیات ظہور، مرتبہ، رؤف امیر، ملتی ہے۔ اس میں ''مقام اقبالؒ '' کے عنوان سے، فارسی اشعار ملتے ہیں؛ جن میں انہوں نے شاعر مشرق، حکیم الامت کا، درج ذیل روش اپناتے ہوئے، مقام بیان فرمایا:

نامور، نیک بخت و نیک خصال — مرد عالی مقام و هم خوش حال
بندۂ با خدا و خیر مآل — قوم را بود رهنما اقبال
نکته پرداز و نی نواز خودی — مطرب خوش نوای ساز خودی
رونق افزای بزم ناز خودی — ساقی بادۂ وفا اقبال
آشنای رموز حریت — ناخدای سفینۂ ملت
درس آموز آیۂ حکمت — رهنمای ره هدیٰ اقبال
رهبر قوم و پاسبان وطن — تازگی بخش گلستان وطن
گوهر تابدار کان وطن! — نور چشم شما و ما اقبال
مهر تابان آسمان سخن — گشت پُرنور ازو جهان سخن
زو فزون گشت قد رو شان سخن — صاحب نالۂ رسا اقبال
فیلسوف جهان، سعادت مند — شاعر حق شناس و دین پسند
ایزدش داد پایگاه بلند! — بود نقاد بی ریا اقبال

مست صهبای دعوت توحید می نمودست شرک را تردید
یاورش بود از خدا تائید خادم دین مصطفیٰ اقبال
رحمت حق ظهور! بروی باد! در بهشت برین روانش شاد
یاد درس وفا به ملت داد بود حق بین و حق نما اقبال

(ظہور، ظہور الحق، ۱۹۹۹ء، کلیات ظہور، ص ص ۳۳۴: ۔ ۳۴۵)

ظہور نے ۱۴ اگست ۱۹۷۷ء کو، بہ عنوان "یادِ اقبال بہ مناسبتِ ۱۴ اوت ۱۹۷۷م، روزِ آزادی پاکستان" اقبال کو خراج پیش کیا:

ای که نامت در جهان چون مهر تابان آمده از کلامت ملتِ خسته به جولان آمده
شد به بانگِ تو جهان بیدار از خوابِ گران دردِ ملّت را پیامِ تو، چو درمان آمده
از رموز بی خودی و هم ز اسرارَ خودی روحِ ما در جسمِ ما، مست و خرامان آمده
یک جهانِ سرشار گشته از شرابِ شعرِ تو غنچۂ امیدِ ملّت از تو خندان آمده
همچو بلبل بوده ای، نغمه سرا در بوستان نغمه ات جان بخش، چون بادِ بهاران آمده
سینه ات آمد چو دریای معانی موجزن برزبانت شعر همچون دُرِّ غلطان آمده
دامنت را، پُر ز گوهرهایِ رومی کرده ای پس چه باید کرد، از تو گنجِ عرفان آمده
داشتی اندر سرت سودا ز عشقِ مصطفیٰ نور در چشمِ تو، از انوارِ قرآن آمده
یاد دادی مر مسلمان را، تو درسِ اتحاد شمع آزادی ز فکرِ تو فروزان آمده
ارضِ پاکستانِ ما تعبیر از خوابِ تو بود خاکِ پاکستان ز لطفِ حق، درخشان آمده
منتشر شیرازۂ ملّت، دگر هرگز مباد! وحدتِ ما، خار در چشمِ حسودان آمده!
مثلِ تودانای راز از حق دگر خواهد ظهورؔ ای که از ضربِ کلیمت کفرلرزان آمده

(مجلہ سروش، اگوست ۱۹۷۷ء، ص ۲۴:)

گرامی، غلام قادر، مولانا: (پیدائش ۱۸۵۶ء۔ وفات ۲۶ مئی ۱۹۲۷ء) برصغیر پاک و ہند کے مشہور اور ممتاز فارسی گو شاعر تھے۔ آپ مختلف اوقات میں مختلف شاہی درباروں سے وابستہ رہ کر ملک الشعرا کی حیثیت تک پہنچے۔ برصغیر کے

کئی معروف شعراء آپ کے شاگرد ہوئے ۔ان میں سے ؛پاکستان کے قومی ترانہ کے شاعر ؛حفیظ جالندھری بھی شامل ہیں ۔(ر۔ک: ویکیپیڈیا) **آپ کا فارسی دیوان" دیوانِ گرامیؔ" کے نام سے ،شیخ مبارک علی ،نے تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور سے چھاپا**۔گرامی کو اقبال سے بہت عقیدت ومؤدت تھی ۔اس کا اظہار مختلف مواقع پر کرتے رہتے تھے ۔ یہاں پر، گرامی کے کلام سے ایک نظم بہ عنوان" نذرِ عقیدت"، پیش کی جاتی ہے،جس میں گرامی نے اقبال سے عقیدت کا اظہار کیا ہے،فرماتے ہیں:

درسِ ماضی از کتابِ حال گیر | ساغر از خمخانۂ اقبال گیر
حضرتِ اقبال،آن بالغ نظر | دارد از بود و نبودِ ما خبر
ما به ذوقِ سوختن کم ساختیم | بی خودی را، از خودی نشناختیم
آن نوا، پردازِ اسرارِ ازل | شهسوارِ عرصۂ علم و عمل
بی خودی را،در خودی منزل شناس | در غبارِ کاروان محمل شناس
از نوائش بزمِ یورپ در خروش | حکمتِ امریکه او را سفته گوش
ناله های آتشینِ آن حکیم | سوخت رختِ فتنۂ امید و بیم
ساخت با دلها و بودش هیچ نیست | سوخت دل ها را، و دودش هیچ نیست

(نذرِ اقبال،۱۹۷۷ء،ص ۲:۔۳)

مظہر،مظہر الدّین،حافظ:(پیدائش ۱۹۱۳: ء/ ۱۹۱۴ء ۔وفات ۲۲: مئی/ ۱۹۸۱ء) حافظ مظہر الدّین مظہر،گورداسپور میں ؛اردو،فارسی،عربی اور پنجابی زبان کے مشہور شاعر اور مشرقی پنجاب کے،مشہور عالم دین اور شیخِ طریقت ؛خواجہ نواب الدّین کے گھر پیدا ہوئے ۔قیام پاکستان کے بعد،ہجرت کر کے پاکستان کے شہر راولپنڈی میں سکونت اختیار کی ۔کیوں کہ انہیں بھی شاعری ورثے میں ملی تھی،اس لئے فارسی و اردو شاعری میں جلد نام پیدا کیا۔(تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند،فروری ۱۹۷۲ء،ص ۶۷۲:)ان کے شعری مجموعے درج ذیل ہیں:

۱۔ شمشیر وسنان (قومی نظمیں)۔ ۲۔ حرب وضرب (قومی نظمیں)۔ ۳۔نور ونار (فارسی و اردو غزلیات/نعتیہ کلام)۔ ۴۔ تجلیات (فارسی واردو نعتیں) (تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند،فروری ۱۹۷۲ء،ص ۶۷۲:) ۵۔ جلوہ گاہ (نعتیہ مجموعہ) ۶۔ باب جبریل (نعتیہ کلام)

۷۔ میزاب (نعتیہ کلام) ۸۔ نشانِ راہ (نعتیہ مجموعہ) ۹۔ ختم المرسلین۔

(ر۔ک: ویکیپیڈیا)

مظہر الدّین مظہر، اقبال کا شیدائی تھا۔ اس کی محبت و عقیدت کا اندازہ درج ذیل اشعار سے ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:

رفت از ما مسند آرائ عُلوم — مرشدِ عرفان، مریدِ پیرِ رُوم
کاشفِ سرِّ خودی، دانای راز — قاسمِ سرمایۂ سوز و گداز
با خدابیباک، مانندِ کلیم — سوخت چون پروانه بر شمعِ یتیم
کوثر و تسنیم در مینای او — می دهد کیفِ خودی، صهبای اُو
از چراغ فکر شد، گیتی فروز — کوکبش راهی دهد، شب را، به روز
بادۂ خُم خانه اش، جانی دهد — آفتبش، نورِ ایمانی دهد
حکمتِ قُرآن بیاموزد مرا — ز آتشِ عشق نبی سوزد مرا
در لباسِ شعر آمد گاه گاه — تا کُنَد شرحِ رموزِ لا اِلٰه
نغمه سنجی های او، جانم ربود — دفرِ سر بَسته را، بر من کشود
شعرِ او، چون ساز و سامانم شده — عشق و مستی دین و ایمانم شده
از سرودش در تب و تابم هنوز — یم به دامان رُو به سیلابن هنوز
با مسلمان گفت، تو هستی نهنگ — وارهان !خود را،ز گرگانِ فرنگ
این جهان ناید به مسلم سازگار — خیز! و از قوّت دگر نقشی برآر!
باش دریا! و به طوفانش نشین! — گوهرِ مقصود از موجش گزین!
حمله آور شو! به ایمانِ حیات — ریزه ریزه کُن! بُتانِ سومنات
تو نه منّت کش !به خیل و سپاه — برگ و سازِ تُست ،سوز لَا اِلٰه
از فقیری بی نوا،پندی پذیر! — روا طریقِ خواجۂ کونین گیر

(بحضور اقبال، جون ۱۹۷۷ء، ص ۵۹:)

نیلما ناہید درانی: (پیدائش ۱۵: اکتوبر ۱۹۵۵ء) نیلما ناہید درانی صحافت کے میدان میں ایک مقام رکھتی ہیں اور اس

کے ساتھ ساتھ، اردو، انگریزی، پنجابی اور فارسی زبان میں شعر کہتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اردو افسانے، سفرنامے اور کالم نگاری ان کی پہچان ہے۔ ان کا تعلق لاہور سے ہے۔ لاہور کالج سے بی۔اے کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔اے فارسی ، ایم۔اے صحافت اور ایم۔اے پنجابی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ محکمہ پولیس میں ایس ایس پی کے عہدے تک پہنچ کر ریٹائر ہوئیں۔ فرائض کی بہ احسن طریق انجام دہی پر کئی ایوارڈ بھی ان کے نام ہوئے۔ (ر۔ک: نیلما درانی ،اردو پوائنٹ urdupoint.com)

آپ اٹھارہ ۱۸ کتابوں کی مصنف ہیں۔ آپ کا اردو شاعری کا پہلا مجموعہ ۱۹۸۶ء میں چھپا۔ ان کا فارسی کلام اب تک نہیں چھپا۔ (انٹرویو نیلما ناہید درانی بذریعہ واٹس ایپ، مؤرخہ ۲۷ نومبر ۲۰۲۱ء) ان کے غیر مطبوعہ فارسی کلام سے نمونہ ملاحظہ فرمائیے!

شاعر شیرین زبان اقبال بود ماہرِ نطق و بیان اقبال بود
دانش آموزد ز رومی و عطار پیرو کارِ خواجگان اقبال بود
همنشین ساقیان باشد ولی حافظ قرآن و دین اقبال بود
تیره شب باشد نصیبِ مومنان آن زمان روشن جهان اقبال بود
فکر او این قوم را بیدار کرد پاسبان و هادی اش اقبال بود
خوابِ او آزاد کرد این خاک را این دیار ما از آن اقبال بود

نیلما ناہید درانی، بہ زریعہ واٹس ایپ، مؤرخہ ۲۳: دسمبر/ ۲۰۲۱

مآخذ و منابع

کتابیں:

بحضور اقبال، جون ۱۹۷۷ء، مرتبین، مصباح الحق صدیقی و تسنیم کوثر گیلانی، شہزاد پبلشرز، لاہور۔
تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، طبع اول، ۱۹۷۲ء، ج : پنجم، زرین آرٹ پریس، ریلوے روڈ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔
احمد، ظہور الدّین، ڈاکٹر، ۲۰۰۵ء، پاکستان میں فارسی ادب، جلد: ششم، مرکز تحقیقات فارسی، ایران و پاکستان، اسلام آباد۔
ضیاء، ضیاء محمد، ۱۹۷۷ء، نوای شوق، مرتبہ: تسبیحی محمد حسین، انجمن فارسی، اسلام آباد۔
ظہور، ظہور الحق، حافظ، ۱۹۹۹ء، کلیات ظہور، مرتبہ، رؤف امیر، معاذ پبلی کیشنز، اسلام آباد۔

ندرِاقبال،۱۹۷۷ء،مرتبہ: تابش،ذوالفقاراحمد،اقبال اکادمی،لاہور۔
(http//www.naatkainaat.org)

مجلے:

مجلہ الزبیر(سہ ماہی)بہاول پور،۱۹۷۷ء،اقبال نمبر،اردو اکیڈمی،بہاول پور۔
مجلہ الزبیر(سہ ماہی)بہاول پور،۲۰۲۱ء،(شمارہ ۱:)،۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔
مجلہ پیغام آشنا،امبر یاسمین(جولائی۔ستمبر/۲۰۱۶ء)،ڈاکٹر مقصود جعفری کی فارسی شاعری پر،ایک نظر،ثقافتی قونصلیٹ،اسلام آباد۔
مجلہ سروش(ماہیانہ)،اگوست ۱۹۷۷ء،جلد ۳،شمارہ ۸،انتشارات ادارۂ مطبوعاتِ پاکستان،اسلام آباد،پاکستان
مجلہ سروش(ماہیانہ)،دسامبر ۱۹۷۷ء،جلد ۳،شمارہ ۱۳،۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
مجلہ سروش(ماہیانہ)،آوریل ۱۹۸۰ء،جلد ۶،شمارہ ۳،۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
مجلہ سروش(ماہیانہ)،ژانویہ ۱۹۸۱ء،جلد ۷،شمارہ ۱،۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
فصلنامہ دانش(سہ ماھی)،شمارہ ۸۴۔۸۵/۲۰۰۶،مرکز تحقیقات ایران و پاکستان،اسلام آباد،پاکستان

Google:

(رک http//www.naatkainaat.org):
(رک: نیلما درانی،اردو پوائنٹ urdupoint.com)
(رک:(ریختہ ادب،گروپ،فیس بک)

انٹرویو:

ڈاکٹر رضیہ اکبر،مارچ ۲۰۲۱ء ،واٹس ایپ
نیلما ناہید درانی،۲۳دسمبر/۲۰۲۱ء،بہ ذریعہ واٹس ایپ

***

تشریح وتوضیح خطبہ اول اقبال ″علم اور مذہبی تجربہ″
از ڈاکٹر جاوید اقبال (تجزیاتی مطالعہ)

* ڈاکٹر محمد خرم یاسین ** پروفیسر ڈاکٹر محمد ارشد اویسی

Explanatory Study of the First Lecture of Iqbal"Knowledge and Religious Experience″ by Dr. Javed Iqbal. A Critical Analysis

Dr. Muhammad Khurram Yasin/Prof. Dr. Muhammad Arshad Ovaisi

″Dr. Allama M. Iqbal delivered a series of seven lectures for the renaissance of religious thoughts of Muslims which later printed under the title “Reconstruction of Religious Thought In Islam”.These Lectures, being the amalgam of Philosophy, Science and Religion became complicated to understand and therefore explanatory work was conducted in this regard. In this article the explanatory study of his First Lecture, ″Knowledge and Religious Experience” by Iqbal’s son, Javed Iqbal is brought into lime light to examine pros and cons of this explanatory study.″.

Keywords: Reconstruction, Religious Thought, Javed Iqbal, Nazeer Niazi, Fawwad, Philosophy, Whitehead

کلیدی الفاظ : تشکیل جدید، سید نذیر نیازی، فواد، فلسفہ، جاوید اقبال، وائیٹ ہیڈ

* معلم شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ ** صدر شعبہ اردو، لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور

علامہ محمد اقبال کے معروف سات خطبات "The Reconstruction of Religious Thought in Islam" (ترجمہ از سید نذیر نیازی : تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ) میں پہلا خطبہ "Knowledge and Religious Experience" بمعنی "علم اور مذہبی تجربہ" ہے۔ اس خطبے میں انھوں نے عصرِ حاضر میں موجود ذرائع علم کی بات کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ سائنسی علم وقت کے ساتھ تغیر و تبدل سے گزرتا رہتا ہے البتہ علم کا ایک ایسا ذریعہ بھی موجود ہے جس کو ٹھوس سائنسی فکر نے بڑی حد تک نہ صرف نظر انداز کر دیا ہے بل کہ وہ اسے علم کا ذریعہ ماننے کے لیے تیار نہیں۔ یہ ذریعہ وہی ہے اور اس کا اعلیٰ ترین درجہ علم بالوحی ہے۔ چوں کہ وحی کا تعلق انبیا کرام سے رہا ہے اور اب انبیا کی آمد کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے اس لیے اس لیے ان کا لایا ہوا علم اور اس کے بعد وجدان ایسے ذرائع ہیں جو محض ٹھوس عقل سے ہی تعلق نہیں رکھتے بل کہ ان میں فواد یا قلبی واردات کا بھی بڑا حصہ موجود رہتا ہے۔ عصرِ حاضر کا انسان جن ذہنی پراگندگیوں کا شکار ہے اس کا واحد حل اس کا مذہب سے از سرِ نو رابطہ بحال کرنا ہے کیوں کہ یہ زندگی کے ان لا ینحل مسائل کا حل بھی پیش کرتا ہے جہاں دیگر تمام علوم بے بس ہو جاتے ہیں۔

خطبے کے موضوع کو پر اثر بنانے کے لیے انھوں نے حیات و کائنات کے بارے میں متشکک لہجے میں ٹھوس فلسفیانہ سوالات اٹھائے ہیں۔ یہ سوالات فطری طور پر ہر انسان کے دماغ میں موجود ہوتے ہیں اور جوں جوں وہ ان پر غور و فکر کرتا ہے، یا تو اس پر کائنات کے اسرار و رموز آشکار ہوتے ہیں یا پھر وہ کسی حد تک ان میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ سوالات ہی انسان کو زندگی کے حقائق کی تلاش و جستجو کی بنیاد مہیا کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں :

"WHAT is the character and general structure of the universe in which we live? Is there a permanent element in the constitution of this universe? How are we related to it? What place do we occupy in it, and what is the kind of conduct that befits the place we occupy"? (1)

یعنی یہ کائنات جس میں ہم رہتے ہیں اس کی نوعیت اور ساخت کس قسم کی ہے؟ اس کا ہماری زندگی میں کیا کردار ہے؟ کیا یہ دوامی ہے یا اس میں کوئی دوامی عنصر بھی موجود ہے؟ اس سے ہمارا تعلق کیا اور کس نوعیت کا ہے؟ اس میں ہمارا مقام و مرتبہ کیا ہے؟ اور اس مقام و مرتبہ سے متعلق ہمیں اس کائنات کے بارے میں کیسا رویہ روا رکھنا چاہیے؟ علامہ محمد اقبال نے ان خطبات کی وجوہات بیان کرتے ہوئے دیباچے میں تحریر کیا تھا کہ دورِ حاضر کا انسان تلاش و جستجو کا خوگر ہے اور اس کے پاس عقلی تقاضے ہی وہ معیارات ہیں جن کی بنا پر فکر کی تشکیل ممکن ہے اس لیے ایسے سوالات کا جنم لینا اور ان کی

تلاش میں کسی منزل تک پہنچنا یا بھٹک جانا دونوں ہی بعید از امکان نہیں۔ دیکھا جائے تو یہ سوالات فطری اور معرفت الٰہی کے حصول، دونوں ہی حوالوں سے اہم ہیں۔ کائنات کے اسرار و رموز اور حقائق کے کھوج میں خالق کائنات کی معرفت حاصل کر لینا عین ممکنات میں سے ہے بشرطیکہ مذہب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے اور نہ ہی فکر بے بنیاد فلسفے تک محدود رہے۔

علامہ محمد اقبال مزید لکھتے ہیں کہ یہ سوالات مذہب، فلسفہ اور شاعری میں مشترک ہیں لیکن شاعری میں ان کا انداز مبہم اور غیر واضح ہے جب کہ مذہب میں واضح اور بہتر۔ اس حوالے سے شاعری اور مذہب کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"Religion, in its more advanced forms, rises higher (2) than poetry".

یہاں مذہب کی ترقی یافتہ صورتوں کا ذکر گیا ہے۔ ہر الہامی مذہب اپنے سے قبل مذاہب سے اس لیے ترقی یافتہ کہلانے کا مستحق ہے کہ وہ اس دور کے انسانوں کے فکری میلانات اور ذہنی رجحانات کے مطابق احکامات و تعلیماتِ الٰہی لے کر آیا اور یہ سلسلہ اسلام تک آ کر رک گیا۔ سید نذیر نیازی نے ترجمہ کرتے ہوئے "Religion, in forms its more advanced" کا ترجمہ "مذہب کے مدارج عالیہ" اور وحید عشرت نے "مذہب اپنی ترقی یافتہ صورتوں میں" کیا ہے۔ یوں علامہ محمد اقبال نے خطبے کے آغاز میں ہی ایسے مابعد الطبیعاتی فکر کے حامل سوالات کے جوابات کی تلاش میں مذہب کی اولین اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ یعنی مذہب حتمی سچائیوں کا مرکز ہے تاوقتیکہ اس میں انسانی تحریفات شامل نہ ہو گئی ہوں یا بعد کے الہامی مذاہب کی وجہ سے متروک نہ ہو چکا ہو۔

علامہ محمد اقبال مذہب کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ فرد سے معاشرے کی جانب بڑھتا ہے۔ اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ انفرادی اصلاح سے اجتماعی بہبود کی جانب جاتا ہے اور یہ بھی کہ یہ نبی سے امت کی جانب بڑھتا ہے۔ اس کی حتمی سچائی اور انسان کے ایمان و ایقان میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے علم کو وسعت دینے کی بھی کوشش کرتی ہے۔ یہاں وہ اس بات کا اضافہ بھی کرتے ہیں کہ فلسفہ، جو کہ خود تشکک پرست اور بار بار اپنی ہی بنیاد پر سوال اٹھانے والا ہے، اسے یہ اختیار حاصل نہیں کہ الہامی مذہب پر سوال اٹھائے۔

"The spirit of philosophy is one of free inquiry. It suspects all authority. Its function is to trace the uncritical assumptions of human thought to their hiding places, and in this pursuit it may finally end in denial or a frank admission of the incapacity of

pure reason to reach the Ultimate Reality."(3)

مذہب انسان کو حقیقتِ مطلق کا پتہ بھی دیتا ہے اور اسے اس کی منزلِ مقصود تک بھی پہنچاتا ہے۔ یہ حتمی سچائیوں کا ایسا بے داغ سلسلہ ہے جو انسان کے کردار اور افعال میں بہتری پیدا کرتا ہے اور اس کی سیرت کو نکھارتا ہے۔ مذہب اور فلسفے کے بعد کی نشان دہی کے بعد وہ عقل اور وجدان کا موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عقل اور وجدان کا منبع ایک ہی ہے۔ بظاہر نفسیات کے مطابق ان دونوں کا تعلق دماغ سے ہے جب کہ روحانی حوالے سے یہ منبع قلب کی جانب ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل بھی کرتے ہیں اور سہارا دے کر آگے بھی بڑھاتے ہیں۔ خطبے کے اختتام پر علامہ اقبال، مذہبی تجربے اور وجدان کے مشمولات پر بات کرتے ہوئے اختتام کرتے ہیں جس سے دوسرے خطبے کا آغاز ہو جاتا ہے۔ یہ خطبہ نہایت فکر انگیز ہے اور عصرِ حاضر کے سائنس پسند دماغ کے لیے اہم روحانی ضرورت کے تحت سامنے آتا ہے۔ ذیل میں خطبہ اول کی اہم توضیح تفہیم از ڈاکٹر جاوید اقبال کی تحقیق و تنقید پیش کی جا رہی ہے۔

فرزندِ اقبال، ڈاکٹر جاوید اقبال نے خطباتِ اقبال کی شرح کے سلسلے میں ''خطباتِ اقبال تسہیل و تفہیم'' لکھ کر تفہیمی ادب میں اہم اضافہ کیا ہے۔ یہ کتاب بھی ساتوں خطبات کی تفہیمات پر مشتمل ہے جس میں سے پہلے خطبے کی تشریح و توضیح درج بالا عنوان کے تحت پیش کی گئی ہے جو کل اکتیس (۳۱) صفحات پر مشتمل ہے۔ ان صفحات میں خطبے کے مباحث کی تشریح و توضیح ساڑھے گیارہ صفحات، خطبے پر اعتراضات کے جوابات کو ساڑھے سترہ صفحات اور آخر میں حواشی و حوالہ جات کو دو صفحات پر پھیلایا گیا ہے۔ ان حواشی و حوالہ جات کی تعداد چھتیس (۳۶) ہے۔ صفحات کی اس ترتیب سے یہ سمجھنا ہرگز مشکل نہیں کہ ڈاکٹر جاوید اقبال کی توجہ محض خطبہ کی تسہیل و توضیح پر ہی نہیں تھی بل کہ ان کے پیشِ نظر خطبے پر ہونے والے اعتراضات بھی رہے ہیں۔ اس تشریح و توضیح کا اسلوب آسان فہم ہے اور یہ چند مقامات پر ترجمے سے قریب تر دکھائی دیتی ہیں مزید یہ کہ تشریح و توضیح کو آسانی کی خاطر دو حصوں میں تقسیم کیا ہے جس میں پہلا حصہ انسان اور علم سے بحث کرتا ہے جب کہ دوسرا حصہ تسخیرِ کائنات، وجدان اور قلب کا عمل بطور ذریعہ علم سے متعلق ہے۔ مجموعی طور پر اس شرح کو اس حوالے سے ایک بہتر کاوش قرار دیا جا سکتا ہے کہ اس میں نہ صرف موضوعاتِ خطباتِ اقبال کی وضاحت دی گئی ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ جہاں تفہیمی اشکالات پیدا ہوتے ہیں یا فکرِ اقبال پر سوالات اٹھائے گئے، ان کا جواب بھی دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے خطبہ اول کی شرح میں سب سے پہلے اس کے عنوان ''علم اور مذہبی تجربہ'' سے بحث کی ہے کہ اس میں ''علم'' کیا ہے ''مذہبی تجربہ'' سے کیا مراد ہے یعنی ان دونوں کا یک جا ہونا یا اتصال کی کیا صورت ہے اور

انھیں علامہ محمد اقبال نے کیوں اکٹھا کیا؟ پہلے ہی صفحے پر اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ علم کے ذرائع عقل، حواس اور وجدان ہیں جب کہ مذہبی تجربے کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے۔ مذہبی تجربہ وحی یا الہام کی صورت میں پیغمبر، کشف کی صورت میں ولی اور القاء کی صورت میں شاعر سے نسبت رکھتا ہے۔ یہ وہ وضاحت ہے جسے اس سے قبل کی کسی شرح میں بیان نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد اس خطبے کے آغاز میں کائنات سے متعلق سوالات کو دوبارہ دہرا کر ان کی وضاحت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ علامہ محمد اقبال نے تحریر کیا تھا کہ حیات و کائنات سے متعلق سوالات فلسفہ، ارفع شاعری اور مذہب تینوں میں ملتے ہیں جن کے جواب بھی بالترتیب تینوں ہی پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے دیگر شارحین کی نسبت ''ارفع شاعری'' کی وضاحت کرتے ہوئے اس کے دائرہ عمل اور عالمگیر روحانی پیغام کی ترسیل میں اسے مذہب سے کم تر سطح پر افراد کو متاثر کرنے والی بیان کیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے فلسفہ اور ایمان کا موازنہ کرتے ہوئے اقبال ہی کی اس مثال کو دہرایا ہے کہ فلسفہ شکوک و شبہات کا شکار رہتا ہے اور ایمان ایک پرندے کی طرح حقیقتِ مطلق تک پہنچنے کے لیے ان حقائق کو بھی پہچان لیتا ہے جو بظاہر نظر نہیں آتے لیکن اس وضاحت میں پرندے کی عقل اور حس کے حوالے سے کچھ ابہام باقی ہے۔ لکھتے ہیں:

''فلسفہ کے برعکس مذہب کی بنیاد ایمان پر استعار کی گئی ہے اور ایمان ایک پرندے کی طرح عقل کی رہبری کے بغیر اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے اپنا بے نشان رستہ ڈھونڈ نکالتا ہے۔ یہ دلیل اس اعتبار سے تو درست ہے کہ پرندہ عقل استعمال نہیں کرتا مگر ''حس'' تو استعمال میں لاتا ہے اور جدید نفسیات کی دریافت کے مطابق ''حس'' وجدان کی بنیادی قرار دی گئی ہے اور وجدان بقول اقبال عقل ہی کی ترقی یافتہ صورت ہے۔''(۴)

خطبہ اول کا اصل متن یہ ہے:

″The essence of religion, on the other hand, is faith; and faith, like(5) the bird, sees its“trackless way” unattended by intellect) ″

اس میں علامہ محمد اقبال ایمان کو پرندے سے تشبیہ دے رہے ہیں نہ کہ حقیقتاً پرندہ کہہ رہے ہیں۔ یہ استعاراتی گفتگو ہے، اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسے اپنے آشیانے سے نکلتے، شکار پر جاتے یا واپس آتے ہر گز عقل کی ضرورت نہیں پڑتی یا ''عقل استعمال نہیں کرتا''۔ درج بالا اقتباس میں تیسری سطر میں اگر پرندے کی جگہ ایمان کی بات کرتے ہوئے کچھ وضاحت کر دی جاتی یا جدید نفسیات کا بھی کوئی حوالہ پیش کر دیا جاتا تو بات کو زیادہ آسان اور مدلل بنایا

جاسکتا تھا اس کے بعد انھوں نے عقل اور مذہب کے حوالے سے اقبال کے خیالات کی وضاحت کی کوشش کی ہے۔علامہ محمد اقبال نے اس حوالے سے متکلمین وصوفیہ اور پروفیسر وائٹ ہیڈ کو الگ الگ بیان کیا تھا، ڈاکٹر جاوید اقبال نے وضاحت کرتے ہوئے انھیں ایک ہی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔تفہیمی حوالے سے تو ان کی کاوش قابل قدر ہے لیکن معنوی لحاظ سے اس میں ردو بدل ہے۔علامہ محمد اقبال مذہب کے بارے میں کہتے ہیں:

"It has something like a cognitive content, and the existence of rival parties–scholastics and mystics–in the history of religion shows that idea is a vital element in religion. Apart from this, religion on its doctrinal side, as defined by Professor Whitehead, is"a system of general truths which have the effect of transforming character when they are sincerely held and vividly apprehended."(6)

جب کہ ڈاکٹر جاوید اقبال نے ان دونوں یعنی متکلمین وصوفیہ اور وائٹ ہیڈ کے حوالے سے علامہ محمد اقبال کے بیان کو ایک ہی بیان بنانے کی کوشش کی ہے جو مفہومی حوالے سے تو درست البتہ از روئے ترجمہ سید نذیر نیازی و ڈاکٹر وحید عشرت بھی درست نہیں۔اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''اقبال تسلیم کرتے ہیں کہ ایمان محض جذبہ ہی نہیں بلکہ اپنے عقائد عقل سے واضح کر سکنے کی اہلیت رکھتا ہے۔آپ تاریخ اسلام کی روشنی میں فرماتے ہیں کہ متکلمین اور صوفیہ کے آپس میں تنازعہ ثابت کرتے ہیں کہ اگرچہ مذہب اپنے عقائد کے اعتبار سے بعض صداقتوں کا نظام ہے جسے خلوصِ نیت سے اپنایا جائے تو انسان کا کردار بدل جاتا ہے۔''(۷)

اس کے بعد ڈاکٹر جاوید اقبال نے علامہ محمد اقبال کے خیالات کہ مذہب کے لیے عقلی دلائل کا مطلب مذہب پر عقلیت کی فوقیت تسلیم کرنا نہیں اور اسلام میں قدیم مذہبی تحاریک کا ذکر کیا اور قرآنِ مجید کو سمجھنے کے لیے ''یونانی فلسفے'' کی عینک کو ضدِ قرآن بھی قرار دیتے ہوئے اصل متن کا اقتباس پیش کیا ہے پھر خطبے کی ترتیب کے مطابق اشاعرہ اور معتزلہ کی تحاریک اور ان کے بعد غزالی و کانٹ کا ذکر کیا ہے۔ترتیب کے اہتمام کے حوالے سے شرح ترجمے سے قریب دکھائی دیتی ہے مثلاً خطبے کا اصل متن اور تشریح کا موازنہ ملاحظہ کیجیے جس میں علامہ محمد اقبال نے غزالی اور ابن رشد کے مذہبی و فلسفیانہ نظریات کا ذکر کیا ہے۔علامہ محمد اقبال لکھتے ہیں:

توضیح وتشریح از ڈاکٹر جاوید اقبال	اصل متن خطبہ اول
اقبال کے خیال میں اسی بغاوت کے زیرِ اثر امام غزالی نے مذہب کی بنیاد ردِ فلسفہ پر رکھی۔ حالانکہ مذہب کو عقلی طور پر سمجھنے کے لیے یہ ایک غیر محفوظ بنیاد تھی بلکہ قرآن کی روح کے بھی خلاف تھی۔ بہر حال اس کے جواب میں ابن رشد نے یونانی فلسفہ کے دفاع میں بہت کچھ لکھا۔"(۹)	"Ghazali based religion on philosophical scepticism a rather unsafe basis for religion and not wholly justified by the spirit of the Qur'an. Ghazali's chief opponent, Ibn Rushd, who defended Greek philosophy against the rebels."(8)

کانٹ اور غزالی کا موازنہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جاوید اقبال نے وضاحت کی ہے کہ کانٹ نے عقل کی حدود بتاتے ہوئے یہ کہہ کر بات ختم کر دی تھی کہ انسان کو عقلِ عملی بخشی گئی ہے عقلِ خالص نہیں جبکہ عقلِ خالص ہی اس کی روحانی ترقی کے راز منکشف کر سکتی ہے۔ غزالی نے اس کے برعکس تصوف کا سہارا لیا اور عقل و وجدان میں ایک ناقابل عبور خلیج حائل کر دی جب کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا کہ ان دونوں کا آپس میں تعلق ہے۔ یوں اس راہ میں غزالی اور کانٹ دونوں ہی سے کچھ کوتاہی ہوگئی۔ ان دونوں فلاسفہ کے حوالے سے اقبال کے خیالات کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اقبال غزالی اور کانٹ کے خیالات پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ دونوں اس بات کو نظر انداز کر گئے کہ عقل علم کی تحصیل کی خاطر اپنی حدود سے آگے بھی نکل سکنے کی اہلیت رکھتی ہے اور اس کا یہ عمل ایک طرح سے ''لامحدود'' کی خاطر ''محدود'' کا استقبال کرنا ہے۔''(۱۰)

شرح کے پانچویں صفحے پر ڈاکٹر جاوید اقبال نے علامہ محمد اقبال ہی کے خیالات کو آسان کر کے دہرانے کی کوشش کی ہے اس میں کچھ نیا شامل نہیں کیا۔ مثلاً پہلے پیرا گراف کی ابتدا ''اقبال کی نگاہ میں عقل جامد نہیں۔۔'' سے ہوتی ہے، پھر درج بالا پیرا گراف بھی علامہ محمد اقبال کے کانٹ اور غزالی سے متعلق خیالات ہی سے شروع ہوتا ہے، دوسرے پیرا گراف کی پہلی سطر ''اس مقام تک پہنچ کر علامہ محمد اقبال فرماتے ہیں۔۔'' چوتھی سطر ''اقبال کو احساس تھا۔۔'' پانچویں سطر ''ان کی نگاہ میں۔۔۔'' ساتویں سطر ''انھیں خدشہ تھا۔۔'' دسویں سطر ''اقبال آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت کا حوالہ دیتے ہیں۔۔'' اور تیسرے پیرا گراف کی پہلی سطر ''اقبال کی رائے میں۔۔۔'' سے شروع ہوتی ہیں۔ پچیس سطور کے صفحے پر علامہ محمد اقبال ہی کے آٹھ اقوال و خیالات اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ علامہ محمد اقبال کے

خیالات کو ان ہی کی زبانی مختصراً بیان کر کے شرح کو آگے بڑھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگلے تین صفحات پر علامہ محمد اقبال کے خیالات کے ماخذات کے طور پر تیرہ قرآنی حوالہ جات کے ساتھ انسان اور کائنات کے رشتے پر غور و فکر کی دعوت کو بیان کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے جن آیات کو بیان کیا گیا ہے ان میں پہلی میں کائنات کی تخلیق کے پس منظر میں سنجیدہ مقصد کا کارفرما ہونا، اسے تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہونا، اس کی ترکیب میں وسعت کی گنجائش، اس کی جامدیت کے بجائے تبدیلی کے امکانات، رات اور دن کی تبدیلی میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں، انسان کو کائنات کو مسخر کر لینے کی دعوت دینا اور اس سلسلے میں کائنات کی تسخیر کے حوالے سے ذرائع کی تلاش، کائنات میں انسان کی حقیقت، گرد و نواح (کائنات) کے منظر میں انسان کی مطابقت اور بھاری ذمہ داری، انسان کی جوابدہی کا عمل، انسان کی طاقت اور اس کے اختیارات، انسان کا اپنی اور کائنات کی تقدیر سازی کا عمل، اپنی پوشیدہ قوتوں کو بروئے کار نہ لانے کی وجہ سے جامدیت کا شکار ہو جانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان آیات کے حوالے سے فکرِ علامہ محمد اقبال پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اقبال مطالعہ فطرت یا سائنسی تحقیق کو ایک طرح کی عبادت سمجھتے ہوئے قرآنی آیات کے حوالے سے ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام بطور مذہب مشاہداتی یا تجربی علوم کی تحصیل کے ذریعہ کائنات کی تسخیر کی دعوت دیتا ہے۔۔۔ بقول اقبال قبل از اسلام کی ساری پرانی دنیا اس لیے ناکام ہوئی کہ اس نے حقیقتِ مطلقہ کو خالصتاً باطنی طور پر جاننے کی کوشش کی اور باطن سے ظاہر کا رستہ اختیار کیا۔''(۱۱)

یہاں تک پہنچ کر انھوں نے ساری بحث کو فلسفہ، مذہب اور ارفع شاعری سے منسلک کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ انسان کی فطرت پر برتری مسلم ہے، قرآن مجید انسان کو فطرت کی تسخیر کی دعوت دے رہا ہے البتہ مذہب کو محض یا کلیتاً عقلی بنیادوں پر ثابت کرنا ممکن نہیں۔ خطبے کے دوسرے حصے کا رخ کائنات کی تسخیر کے لیے وجدان کی جانب ہے۔ وجدان کا تعلق قلب سے ہے اور دل محض خون رواں رکھنے کا ایک جسمانی آلہ نہیں بلکہ معرفتِ الٰہی کا ذریعہ بھی ہے۔ اسی کا تعلق مذہبی تجربے سے ہے۔ اس حوالے سے فکرِ اقبال کا اجمالی جائزہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ علامہ محمد اقبال کی نظر میں ''دل'' ایک طرح کا وجدان یا بصیرت ہے اور قرآن کریم کے قول کے مطابق دیکھ سکنے کی طاقت رکھتا ہے۔ مزید یہ کہ اس کی پہنچائی گئی معلومات کا اگر درست تجزیہ کر لیا جائے تو غلط بھی نہیں ہوتیں۔ یوں اسے دیگر تجربوں سے حاصل ہونے والی معلومات سے کم تر نہیں سمجھنا چاہیے۔

تسہیل کے اختتام پر انھوں نے مذہبی تجربات کی اُنھیں خصوصیات کا ذکر کیا ہے جو اقبال نے اجمالاً

تشکیل جدید میں بیان کی تھیں۔ ان میں پہلی خصوصیت اس تجربہ کا یکلخت اور فی الفور ہونا، دوسری خصوصیت اس کی ناقابل تقسیم کلیت، تیسری اس میں ابلاغ کی ایسی صورت کہ صوفی کا گہرا رابطہ ایک ایسے یکتا وجود سے ہو جانا جس کے حاوی ہونے کے سبب اس کی اپنی شخصیت دب جاتی ہے، چوتھی خصوصیت اس تجربے کے اظہار کی ناممکنات اور پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صوفی کو اگرچہ احساس ہوتا ہے کہ وہ زمانِ متسلسل سے کٹ گیا ہے لیکن درحقیقت ایسا نہ ہونا شامل ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر جاوید اقبال نے نہایت مفصل انداز میں اس خطبے پر ہونے والے اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ عمومی طور پر فکرِ اقبال پر اعتراضات کی نوعیت یہ رہی ہے کہ علامہ محمد اقبال نے آیات کے نئے معانی بیان کیے ہیں اور ان کے مطالب کو حسبِ منشا استعمال کیا ہے۔ اس پر ان کا یہی جواب رہا ہے کہ قرآنِ مجید کسی ایک دور یا ایک شخص کے لیے نازل نہیں ہوا۔ رہتی دنیا تک نہ صرف مختلف مضامین کے ماہرین اس سے نئے نئے معانی اخذ کرتے رہیں گے بلکہ یہ مساوی طور پر فائدہ مند بھی رہے گا۔ یوں یہ تشریح و توضیح اس حوالے سے بھی ممتاز ترین مقام رکھتی ہے کہ اس میں ان اعتراضات پر بات کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو دیگر شروح میں موجود نہیں۔ مجموعی طور پر اس تشریح و توضیح کو فکرِ اقبال کی تفہیمی کاوشات میں اہم اور نمایاں مقام دیا جا سکتا ہے۔

حوالہ جات

1.Muhammad Iqbal, Dr., The Reconstruction of Religious Thought in Islam, Lahore: Iqbal Academy Pakistan, 2011,P:1

2.Ibid 3.Ibid 4.Ibid, P:17

۴۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، خطباتِ اقبال تسہیل و تفہیم، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء، ص ۲۷:

5.Muhammad Iqbal, Dr.,The Reconstruction of Religious Thought in Islam, P:1

6.Ibid

۷۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، خطباتِ اقبال تسہیل و تفہیم، ص ۲۷:۔ ۲۸

8.Muhammad Iqbal, Dr.,The Reconstruction of Religious Thought in Islam, P:3

۹۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، خطباتِ اقبال تسہیل و تفہیم، ص ۲۹:

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۰: ۱۱۔ ایضاً، ص ۳۳:

اقبال کی شعری ہمہ گیریت

*ڈاکٹر قندیل بدر

Iqbal's poetic versatility

Dr. Qandeel Bader

Iqbal's Poetic Universality

A lot of work has been done on Iqbal's poetic personality in the past century. Many essential efforts to grasp his intellect with all its details have come to the fore. It has not been possible now to completely elaborate any key aspect of Iqbal's intellect in a short article. Even in this short paper, a mere learner's effort has been made to elaborate the mature intellectual foundation of Iqbal. Total wisdom's utility of Iqbal emphasises on the extent of his readings. But his readings never impaired his own versatility. He was fully aware of the true soul of his ideology. Therefore, he protected his ideology from all kinds of adulteration and distortion. He used the worldwide knowledge to the extent of argument for a better presentation and elaboration of his ideology. This is the actual glory of Iqbal that his poetry purely portrays his very own ideology and cannot be stamped of being someone else's.

Key Words: Iqbal, Bergson, Dante, Goethe, Nietzsche, Carl Marx, Bedil, Rumi, Islam.

* صدر شعبہ اردو، سردار بہادر خان ویمن یونیورسٹی کوئٹہ

عظیم فن کار وہی ہے جس کے فن میں ایسے کئی امکانات پوشیدہ ہوتے ہیں جن کی حدود کے تعین اور تفہیم کرنے کے لیے بھی کئی نابغہ روزگاروں کی ضرورت درپیش ہوتی ہے ۔ بلا شبہ اردو شاعری میں اقبال اسی عظمت کے پیش کار ہیں ۔ایک ایسے فنکار جن کی ہمہ جہت شخصیت ہر دو حوالوں سے آفاقی اور کائناتی حیثیت کی حامل ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر میں پچھلی ایک صدی سے ان کی شعری تفہیم کا سلسلہ پوری توانائی کے ساتھ جاری اور ساری ہے ۔ان کی شخصیت کے ہمہ جہت پہلوؤں پر اب تک اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ مزید کی گنجائش نکالنا بھی ایک علمی مرتبے کے کام کا درجہ پا چکا ہے ۔ان کی توصیف و تحسین کو پیغمبرانہ صفات تک بلند کرنے کے ساتھ ساتھ ان پر کیے جانے والے اعتراضات اور تنقید کا پلہ بھی خاصا بھاری رہا ہے ۔ یہ بھی ایک نابغہ کا وصف ہے جو ذہن جتنا وسیع ہوگا اتنا ہی متنازع ٹھہرایا جائے گا۔اقبال جیسے علمی پیاسوں کے ساتھ یہ رویہ المیاتی طور پر منسلک رہا ہے ۔ان کے کلام کو آزاد نہ پڑھنے اور سمجھنے کی روش کبھی عام نہیں رہی ۔مختلف لیبل چسپاں کر کے یا مختلف Frames میں زبردستی مقید کر کے ان کی تعبیرات پیش کی گئیں ۔اقبال کو شاعر مشرق کہا جائے سیاسی مفکر یا مسلم فلسفی ،یہ سب خطابات ان کی آفاقی روح کے منافی اور ان کی وسعت کے گرد دیواریں اٹھانے کے مماثل ہیں ۔اقبال کے ناقدین ان سے لاکھ علمی فنی یا نظریاتی اختلافات رکھتے ہوں لیکن ان کے ہمہ وقت علمی تڑپ اور حصول کی جہدِ مسلسل میں لگے وجود کی بڑائی کے معترف ضرور ہیں ۔اقبال کی قد آور علمی شخصیت کے ضمن میں ڈاکٹر راشد حمید کی یہ رائے دیکھیے:

"علامہ اقبال برصغیر میں پیدا ہونے والے چند بڑے مفکرین میں سے ایک ہیں ۔وہ اتنے بڑے مفکر ہیں کہ ان کے تمام تر علمی اور فکری موضوعات کا احاطہ ایک جست میں تو شاید ممکن ہی نہیں اور یہ ایک شخص کے بس کی بات بھی نہیں کہ وہ ان کے افکار کی تمام جہتوں کا ادراک کر سکے ۔ ہر دور میں مختلف الخیال لوگوں نے اپنے اپنے انداز اور اپنے اپنے مطالعاتی افادات کے اعتبار سے فکر اقبال کو سمجھنے کی کوشش کی ہے ۔کوئی شخص بھی مجموعی حوالے سے فکر اقبال کی تفہیم اور ترویج کا دعوے دار نہیں ہو سکتا۔فکر و کلام اقبال کی بے پناہ جہتیں ہیں ۔کوئی بھی اپنے ذوق کے مطابق ان کی شاعری کے ایک رخ پر زیادہ مطالعہ کر لیتا ہے لیکن دوسری بے پناہ جہتیں رہ جاتی ہیں ۔علامہ اقبال، مغرب و مشرق کے اتنے بڑے جامع ہیں کہ ان کے ہاں یہ دونوں دھارے باہم ملتے ہوئے واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں ۔اس لیے اقبالیاتی فکر کی تفہیم و تشریح کے لیے بہ یک وقت کئی ایک علوم و فنون میں مہارت لازمی امر ہے ۔بیسویں صدی میں اقبالیات میں جو ماہرین سامنے آئے وہ اپنی تمام تر علمی و فکری جامعیت کے باوجود اقبال کی کلی تفہیم کا حق ادا نہیں کر سکے ۔" [۱]

اقبالیات کے لاتعداد ماہرین نے ان کے ذہنی، تدریجی ارتقا کی کئی صورتوں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ان کی فکری تبدیلیوں اور ذہنی ارتقا کو سمجھنے کے لیے زیادہ تر ادوار بندیاں کی گئیں جن میں ان کی زندگی کے اہم وقعات کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔عمومی طور پر اقبال شناسی کے ضمن میں چار ادوار (یورپ جانے سے قبل ،قیام یورپ ،واپسی سے بانگ درا کی اشاعت اور مابعد سے وفات تک) کو ملحوظ رکھا گیا۔اقبال کو سمجھنے کے لیے یہ ادوار بندی بھی بلا جواز نہیں لیکن ان جیسی ہمہ وقت مضطرب روح کو اس طور مکمل طور پر گرفت میں لینا ممکن نہیں۔درحقیقت ان کے ذہنی ارتقا کے اہم محرکات مشرق ومغرب کے وہ جید علما ہیں جن کے زیر اثر ان کی فکری نشو ونما ہوئی۔اقبال ایک درویش صفت شخصیت اور ہمہ وقت خواب دیکھنے والے شاعر تھے ۔اس سے سبھی واقف ہیں کہ وہ اپنے فن کو کار خیر سمجھتے تھے اور اسے انسانوں کی اصلاح کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔وہ اپنے مرغوب مضمون 'فلسفہ' کو بھی ہر خاص وعام کے لیے مفید بنانا چاہتے تھے اور بالخصوص شعوری عمل سے شعر میں ڈھالنا چاہتے تھے۔اسی خواہش کی تکمیل میں انہوں نے علم پرور کتنی ہی وادیوں اور صحراؤں میں پڑاؤ ڈالے۔کتنے ہی جنگلوں، سمندروں سے گزر ہوا لیکن تشنہ کامی نہیں گئی۔وہ اپنی پیاس کو کسی چشمے کی دید سے تھوڑی دیر سہلاتے پھر سوال اور خواب اپنے کاندھوں پر اٹھائے کسی اگلی منزل کی جانب چل پڑتے۔اقبال ایک متحرک ذہن رکھتے تھے،ٹھہرنے کو موت کی علامت جانتے تھے۔یہی سبب ہے کہ عظیم عالمی اذہان کچھ دیر کے لیے ان کو جھنجھوڑتے،ان کی توجہ کا محور بنتے،ان کو مسحور کرتے،وہ کچھ عرصے ان میں قیام کرتے،ان کا رس کشید کرتے اور پھر اپنا ساز وسامان اٹھائے کسی نئے علمی نخلستان کی جانب روانہ ہو جاتے۔یوں سقراط سے لے کر مارکس تک،رومی سے لے کر بیدل تک،میر سے لے کر غالب تک،دانتے سے لے کر گوئٹے تک،مشرق ومغرب کے بے شمار فلسفیوں اور شاعروں نے اقبال کی فکر کے لیے مہمیز کا کام دیا لیکن اقبال نے ان سے اختلاف کی جرأت بھی کی اور اپنے افکار کو محض ان کی تقلید یا پیروی تک محدود رکھنے کی بہ جائے ان میں اپنی دانش سے نت نئے اضافے بھی کیے یوں جن نظریات وتصورات کی ترسیل وتشہیر اپنی شاعری اور خطبات کے ذریعے کی،وہ بڑی حد تک ان ہی سے منسوب ہیں۔اس مختصر مقالے میں،اسی اہم نکتے کی ذیل میں چند اہم تصورات کے سلسلے میں ان کے استفادے اور اس پر ان کے ذاتی اضافوں کا اجمالی تذکرہ کرتے ہیں۔

ابن رشد کا کہنا ہے کہ انسانی روح/ذہن کا وہی حصہ باقی رہے گا جو عقل فعال میں جذب ہو جائے گا۔اسے نظریہء وحدت بھی کہا جاتا ہے۔اقبال کے ذہن کا وہ حصہ جو عقل فعال کہلانے کا مستحق ہے،اس کی کئی جہتیں ہیں۔قیام

مغرب کے دوران جہاں ایک طرف یورپی فلسفیوں کے علمی اور فکری جوہر انہیں متاثر کر رہے تھے وہیں دوسری طرف مسلمانوں کی دربدری اور مفلوک الحالی انہیں بے پناہ مضطرب رکھے ہوئے تھی۔اس ذہنی کش مکش میں شعر گوئی واحد مرہم ثابت ہوئی اور اظہار کا بہترین ذریعہ بھی۔ابتدائی طور پر یہی گمان غالب رہا ہوگا کہ شعر گوئی محض زخموں کا مرہم بن سکتی ہے اس سے کوئی بڑا کام نہیں لیا جاسکتا لیکن ڈاکٹر آرنلڈ جیسی شخصیات کی صحبت اور مشوروں نے ایک نئی راہ روشن کی اور وہ یہ کہ اقبال اپنی شاعری کے ذریعے اپنے افکار کی تبلیغ کر سکتے ہیں،ایک بڑی تبدیلی لا سکتے ہیں اور اپنی قوم کی حالت بھی بدل سکتے ہیں۔یوں اقبال نے نہ صرف شاعری کو بل کہ فلسفے کو بھی اپنی قوم کی ذہنی وفکری تشکیل کا وسیلہ سمجھا اور انتہائی سنجیدہ کاوشوں میں مشغول ہو گئے۔جس کے ثمرات جلد ہی دکھائی دینے لگے۔اقبال نے ایک بالکل نئی طرز کی شاعری کی بنیاد رکھی جس کا تصور اردو اور فارسی شاعری میں ناپید تھا۔ان کی اسی انفرادیت نے نہ صرف انہیں ان دونوں زبانوں کے اہم ترین شعرا کی صف میں جگہ دلائی بل کہ اپنے خطے کے اہم ترین فلسفیوں میں بھی۔فلسفہ تمام علوم کا بنیادی ماخذ سہی لیکن اس کے برتنے سے شاعری کی لطافت ضرور مجروح ہو جاتی ہے۔اقبال کا اصل کمال یہی ہے کہ انہوں نے شاعری کی روح کو مجروح کیے بغیر اسے دنیا کے تمام تر فلسفیانہ افکار کی پیش کش کا وصف عطا کر دیا۔اقبال کا بہ حیثیت فلسفی جو بھی مقام ہو لیکن اپنی تمام تر صورتوں میں وہ ایک اعلی پائے کے شاعر ہیں۔بہ قول یوسف ظفر:

''عظیم ترین فلسفہ بھی ایک نااہل تک بند کو شاعر نہیں بنا سکتا۔شاعری کے اپنے پیمانے ہیں اور اپنے میزان۔جب تک کوئی کلام ان پیمانوں کے مطابق نہیں،ان میزانوں پر پورا نہیں اترتا،وہ قلم رو سخن میں داخل نہیں ہوسکتا۔اقبال کی عظمت اس میں ہے کہ اس کے ہاتھ میں ہر خیال،ہر تصور،ہر فلسفہ،ہر جذبہ ایک ایسا لازوال پیکر بن گیا ہے کہ اس کی جمالیاتی اور ادبی حیثیت صدیوں قائم و باقی رہے گی۔'' [۲]

ابتدائی شاعری میں اقبال پر جس مغربی تحریک اور رجحان کا غلبہ دکھائی دیتا ہے وہ رومانیت ہے۔ان کی پہلی مقبول نظم ''ہمالہ'' ہی میں ان کی فطرت پرستی اور مظاہر فطری سے لگاؤ کو مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ان کی اس طرز کی شاعری پر ورڈزورتھ کے اثرات واضح ہیں۔وہ فلاطینوس کی طرح حسن کو ہمہ گیر مظاہر میں دھڑکتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔اقبال کے زمانے میں پنجاب یونیورسٹی سمیت دوسرے اداروں کے نصاب میں انگریزی رومانیت کو شامل کیا گیا جس کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ سارے ملک میں رومانیت کی ایک لہر دوڑ گئی رومانیت کی فطری شاعری اور نو فلاطونی جمالیاتی نظریوں نے بالخصوص اردو ادیبوں پر خاصا اثر ڈالا۔اس ضمن میں علی عباس جلال پوری لکھتے ہیں:

''انیسویں صدی کے آواخر میں انگریزی زبان اور ادب کے وسیلے سے رومانویت نے ہندوستان میں رواج پایا۔سرکاری مدارس میں جو انگریزی نصاب مقرر کیا گیا۔اس میں رومانی شعرا ورڈورتھ، شیلے، بائرن، کولرج، اور کیٹس کی نظمیں اور سر والٹر سکاٹ کے ناول شامل تھے۔اس کے لیے پڑھے لکھے طبقے کے ذہن وقلب پر رومانیت کا تسلط ہوگیا۔عبدالحلیم شرر اور محمد علی طیب نے والٹر سکاٹ اور الیگزنڈر ڈوما کی تقلید میں تاریخی رومان لکھنا شروع کیے۔اقبال بھی اس رومانی تحریک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔'' ۳

ہندوستان میں رومانیت محض اس لیے مقبول نہیں ہوئی کہ یہ نصاب میں شامل ہوگئی تھی بل کہ اس مٹی کا مزاج قدرے رومانوی رہا ہے۔مغربی رومانی شعرا وفلاسفہ عقل وخرد پر جذباتی تخیل کو فوقیت دیتے ہیں بل کہ تخیل اور وجدان ہی کو عقل و دانش کا ماخذ قرار دیتے ہیں۔مغربی رومانیت فارس وہند کے صوفیہ اور ویدانتوں کے نقطہ نظر سے بھی خاصی ہم آہنگ ہے۔جب یورپ صنعت کارانہ اور تیز رفتار دور میں داخل ہوا تو انیسویں صدی کے آواخر تک رومانیت کا زور وہاں ٹوٹ گیا اور حقیقت پسندی Realism اور فطرت پسندی Naturalism جیسی تحریکوں نے رواج پایا لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ یہ تحریکیں ہمارے خطے میں مقبول نہ ہوسکیں شاید اس کی وجہ ان تحریکوں کی سائنس یا عقلیت پسندی تھی یا پھر یہ یہاں کے رومانوی مزاج سے لگا نہیں کھاتی تھیں۔

رومانیت کی دوسری بڑی خاصیت یا اصول 'خود مرکزیت' ہے نفسیات کی زبان میں اسے God-Complex کہتے ہیں۔یعنی رومانی شعرا، ادیب اور سیاست دان اس زعم بے جا کا شکار ہوتے ہیں کہ ان کے تخیل اور ان کی ذات کے دکھ کے ساتھ قوم وملک کی فلاح و بہبود وابستہ ہے۔ایک رومانی فلسفی اپنے محدود ذہن کو تمام کائنات کا خالق گردانتا ہے۔اور اپنی انا کی ساخت پہ حقیقت اولی Supreme Reality کا تصور کرتا ہے۔رومانی دنیاوی پابندیوں کو برداشت نہیں کرتے اس لیے بغاوت کرتے ہیں۔وہ تخیل کو اسلوب کی پابندیوں سے نجات دلانا چاہتے ہیں۔جیسے روسو جو عظیم رومانی فلسفی ہے اس کی تمام تحریروں میں ذاتی عنصر غالب ہے۔جرمن رومانی فلسفی کانٹ اس سے پہلے اس بات کی توجہ دلا چکا تھا کہ ارادے کی آزادی توصیف جمال کی تعین پر کارفرما ہوتی ہے، شوپن ہائر نے اس بات پر زور دیا تھا کہ ارادہ بھی تشکیل کائنات میں شامل کار ہے۔رومانیت کی ایک خاصیت ماضی پرستی ہے ماضی کس قدر دل کش ہے اس میں فرار ڈھونڈنا شاید انسانی وطیرہ ہے۔اسی طرح بچپن کی عمر کو رومانی مثالی عمر گردانتے ہیں ان کی شاعری میں Nostalgia ایک خاص عنصر ہے۔رومانیت کے یہ تمام خواص اقبال کی شاعری

میں کہیں نہ کہیں نشان زد کیے جاسکتے ہیں۔اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ اقبال طبعیتاً رومانی تھے تخیلات کی دنیا میں رہتے تھے۔مسلمانوں کے لیے دیکھے گئے ان کے تمام خواب ان کی رومانیت کا بین ثبوت ہیں۔اقبال کا بنیادی مسئلہ اسلام کو نئی تازگی اور ولولہ دینا تھا اور مسلمانوں کو دنیا کی عظیم الشان قوم بنانا تھا۔یورپ سے واپسی پر ان کی فکر میں ایسی انقلابی تبدیلیاں آئیں جن کے زیر اثر ان کی اصلاحی شاعری کا باقاعدہ آغاز ہوا لیکن درحقیقت اقبال کو رومانیت کی خرد دشمنی بہت پسند آگئی تھی ۔

اقبال کے دو بنیادی تصورات 'تصور خالق کائنات' اور 'تصور زمان و مکاں' ہیں جو بلا شبہ ان کے ذہنی ارتقا کے ماخذات قرار دیے جاسکتے ہیں۔یہ نظریات ان کے مشرقی مابعد الطبیعات کے مطالعے کی دین ہیں جس پر مغربی فلاسفہ کے اثرات بھی واضح دیکھے جاسکتے ہیں۔جہاں تک تصور ذات باری یا خالق کائنات کا تعلق ہے،اقبال فلسفہ ارتقا کے سریانی یعنی وجودی تصوف کے نظریے سے متاثر تھے لیکن بیسویں صدی کے اوائل میں برگساں ؒ نے اسپنسرؒ کے نظریہ زمان پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ طبعیاتی سائنس کا نقطہ نظر میکانکی ہے جس کے باعث وہ زمان کو آنات اور لمحات میں تقسیم کر کے دیکھتے ہیں۔اس لیے سائنس دان زمان کی ماہیئت سے بے خبر رہتے ہیں۔ان کے خیال میں زمان کا داخلی اور وجدانی مطالعہ کرنے سے اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ مرور ایک مسلسل ارتقائی حرکت ہے جو ہر لمحے نئی نئی کیفیات کی تخلیق کرتی ہے۔اسی بنا پر برگساں ؒ نے اپنے اس نظریے کو 'تخلیقی ارتقا' کا نام دیا۔اس نے کہا کہ عقل انسانی مرور محض مخصوص زمانی دورانیہ سمجھنے سے قاصر ہے 'لامکاں' کا ادراک صرف ایک قسم کی باطنی قوت سے ہوسکتا ہے جسے وجدان کہتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ اقبال پر لائیڈ مارگن اور الیگزنڈرؒ کے نظریہ ارتقائے بروزیؒ کا بھی خاصا اثر ہوا۔اس نظریے کے مطابق ارتقا کا عمل مسلسل اور لا متناہی ہے اور کسی خاص نقطے پر پہنچ کر اس رک جانے کا کوئی امکان نہیں ہے۔یہ دونوں فلسفی کہتے ہیں کہ مادے سے حیات کا ارتقا ہوا ہے حیات سے ذہن انسانی کا اور ذہن انسانی کا یہ عمل یزدانیت (Divinity) یعنی علویت کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے۔ارتقائے بروزی (Emergent Evolution) اور تخلیقی ارتقا (Creative Mind) کے نظریات نے بھی اقبال پر گہرا اثر ڈالا لیکن ان کا تصور زمان و مکان بڑی حد تک برگساں سے قریب ہے لیکن اقبال اس کے نقطہ نظر کی ترجمانی بھی اسلام کی روشنی میں کرتے ہیں۔ڈاکٹر رضی الدین صدیقی ان کے تصور زمان و مکاں سے متعلق رقم کرتے ہیں:

''اسلام نے زمان کو حقیقی مانا ہے اقبال بھی اسے حقیقی تصور کرتے ہیں۔اگرچہ طبیعی زمان۔مکان جس میں انسانی عقل

چکر لگاتی ہے، اصل حقیقت نہیں۔ چناں چہ کہتے ہیں :

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری　　نہ ہے زماں نہ مکاں لا الہ الا اللہ

ہستی و نیستی از دیدن و نادیدن من　　چہ زمان و چہ مکان شوخی افکار من است

وہ زندگی کو زمان میں ایک مسلسل حرکت سمجھتے ہیں۔ ان کا ایقان ہے کہ انسان اپنے جسم اور روح کے ساتھ مل کر ایک ہی وحدت ہے۔ اور یہ تصور غلط ہے کہ انسان کو دو مختلف حقیقتوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔"[۴]

کہا جاتا ہے قیام یورپ کے دوران اقبال کی برگساں سے ملاقات بھی ہوئی تھی۔ اقبال اس شخصیت سے کئی حوالوں سے متاثر تھے۔ برگساں کا عہد سائنسی مادہ پرستی کا عہد تھا وہ اس کی میکانیت سے سخت نالاں تھا چناں چہ اس نے مادہ پرست یورپ کی میکانکی زندگی پر سخت تنقید کی اور روحانیت کا راستہ دکھانے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے لکھا ہے:

"اقبال، برگساں کے خیالات سے پوری طرح متفق ہیں۔ دونوں حکما وجدان ذات کے ذریعے عقل کی تردید کرتے ہیں اور وجدان کو شمع ہدایت قرار دے کر غور و فکر کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔ دونوں کے نزدیک وجدان کے ذریعے ،ذات نفس کا صرف اثبات ہی نہیں ہوتا بل کہ اس کی حقیقت بھی منکشف ہوتی ہے۔ دونوں کا خیال ہے کہ وجدان ہی کے ذریعے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ہماری ذات بہ یک وقت وحدت اور کثرت کی حامل ہے۔۔۔ دونوں کے نزدیک ذات نفس ایک مسلسل انقلاب اور ایک پیہم سلسلہ تغیر کی حامل ہے لیکن اس انقلاب و تغیر کا مقصود کیا ہے؟ یہ سوال برگساں نے نہیں اٹھایا تاہم اقبال کے نزدیک یہ سوال نہایت ہی اہم ہے۔"[۵]

ضمیر علی بدایونی کے باوصف اقبال بیدل کے بڑے معتقد تھے لہذا انہوں یہ نظریہ برگساں کی بہ جائے بیدل سے اخذ کیا ہے۔ اقبال نے اپنے ایک انگریزی مضمون میں※※ "Bedil in the light of Bergson" میں یہ ثابت کیا ہے کہ برگساں نے یہ نظریہ بیدل سے لیا ہے۔ ضمیر علی بدایونی لکھتے ہیں:

"برگساں اور بیدل کے تصور وقت میں فکر کی ایک ہی رو بہتی نظر آتی ہے۔ بیدل کا فلسفہ امروز برگساں کے دائمی امروز (Eternal Now) کا پیش رو ہے۔ اس کے علاوہ اقبال نے بیدل کے تصور وقت کو بڑی جامعیت اور گہرائی سے پیش کیا ہے اور اسے برگساں کا پیش رو قرار دیا ہے۔"[۶]

اقبال کی رومان پسند طبعیت پر جب مشرقی صوفیا، رومی، بیدل اور میر جیسے شعرا کے تصور عشق اور برگساں کے

تصور وجدان کے اثرات پڑے تو ان کی خرد و عقل دشمنی نے ایک خاص روش اختیار کر لی۔ وہ جانتے تھے کہ عشق اور وجدان کے ذریعے جس مقام تک رسائی ممکن ہے اس مقام کا شعور بھی عقل کے بس کی بات نہیں ہے۔ دراصل اقبال فلسفہ جدید کے رومانی مکتب ہی سے متاثر تھے نیٹشے کی انا (Egoism) شوپن ہائر کی (Voluntarism) ارادیت اور برگساں کے تخلیقی ارتقا کے نظریے کو بھی رومانی ہی کہا جا سکتا ہے کیوں کہ یہ تمام تصورات عقل و خرد یا منطقی استدلال کو معیارِ فکر و نظر سمجھنے کی بہ جائے ارادے یا وجدان پر اپنے نظریات کو تشکیل دیتے ہیں ::

نکل جا عقل سے آگے کہ یہ نور — چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے
عقل گو آستاں سے دور نہیں — اس کی تقدیر میں حضور نہیں
عقل میں بھی سرور ہے لیکن — یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں
اک جنون ہے جو با شعور بھی ہے — اک جنون ہے جو با شعور نہیں
اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل — لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے
عقل کو تنقید سے فرصت نہیں — عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ
جز واقف نہیں ہے نیک و بد سے — بڑھی جاتی ہے ظالم اپنی حد سے
خُدا جانے مجھے کیا ہو گیا ہے — خرد بے زار دل سے، دل خرد سے
یہ عقل جو مہ و پرویں کا کھیلتی ہے شکار — شریک شورش پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اقبال نہ صرف ایک اصلاح پسند شاعر ہیں بل کہ انقلاب کے بھی پرزور مبلغ ہیں اور انقلابی اقدامات کے لیے نہ صرف سیاسی حوالے سے طاقت ور بننے کا درس دیتے ہیں بل کہ اخلاقی اور سماجی حوالوں سے بھی فرد کی قوت کی بحالی کے خواہاں ہیں۔ رسل کے مطابق نیٹشے اور برگساں کا فلسفہ درحقیقت ''قوت پسندی'' کا غماز ہے۔ اور اقبال اس ضمن میں نیٹشے سے خاصے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے کلام میں کئی جگہوں پر وہ نیٹشے کی تعریف کرتے نظر آتے ہیں۔ کئی تمثیلات بھی نیٹشے سے ماخوذ کی ہیں جیسے ہیرہ، قطرہء شبنم اور کوئلہ وغیرہ۔ اقبال کے ہاں بھی نیٹشے کی طرح طاقت کو خیر اور کم زوری کو شر کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ دونوں کے ہاں اخلاق کا معیار بھی زیادہ تر ایک جیسا ہے۔ جو چیز خودی کو تقویت دے وہ خیر ہے اور جو اسے کم زور کرے وہ شر ہے۔ یہاں قوت کا سرچشمہ سراسر مرد کو قرار دیا گیا۔ اقبال کا مردِ مومن بھی نیٹشے کے Macho Man جیسی کئی خصوصیات رکھتا ہے۔ اقبال کی مردِ حق اور مردِ مومن کے لیے پیش کردہ کئی تماثیل

جیسے عقاب اور شاہین وغیرہ کئی دیگر اہم صفات رکھنے کے باوجود بھی تنقید کا نشانہ بنتی رہی ہیں جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ علائم زیادہ تر جھپٹنے، حملہ آور ہونے اور چیر پھاڑ کرنے والی یعنی منفی صفات کی حامل قرار دی جاتی رہی ہیں۔ نیٹشے کے نزدیک کامیاب جنگ ہر عذر کو مقدس بنا دیتی ہے۔ اقبال بھی اسرارِ خودی میں یہی درس دیتے ہیں، کہ اگر کوئی مدعی طاقت ور ہوگا تو اس کے دعوے کی صداقت کے لئے یہی دلیل کافی ہے کہ وہ طاقت ور ہے۔ حق اور باطل کا معیار قوت ہے، قوت سے باطل میں بھی حق کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی رقم طراز ہیں:

''انہوں نے دو متضاد چیزوں یعنی رومی جیسے زبردست صوفی اور ڈارون کے ملحدانہ نظریہ ارتقا کے قائل نیٹشے کو جمع کر دیا۔ نیٹشے کا مافوق البشر بعض اوقات ایک مافوق الحیوان کی گھٹیا صورت پر اتر آتا ہے اور انسانی ارتقائے روحانی کے طویل دور میں جو روحانی قدریں وجود میں آتی ہیں ان کو پست ترین تصورات میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اگر چہ اس کا دماغ کافر ہے لیکن قلب مومن ہے۔''[۷]

قوت پسندی سے متعلق یہ تمام خیالات زیادہ تر نیٹشے سے مستعار لیے گئے ہیں۔ ایسے افکار وقتی جوش ولولہ تو پیدا کر سکتے ہیں مگر کوئی خاطر خواہ تبدیلی لانے سے قاصر ہوتے ہیں۔ نرگسیت مردانگی، حملہ آوری، خود کو کل جاننا، دراصل نفسیاتی کمزوریاں ہیں، جن سے معاشرے ترقی نہیں کر سکتے۔ فوق البشر کوئی Ideal Human نہیں ہے بل کہ ایک طاقت ور ہے۔ یہی سبب ہے کہ اقبال پر جلد ہی نیٹشے کے نظریے کی خامیاں بھی کھلنے لگیں اور وہ اکثر مقامات پر اس کی شدید مذمت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جب اس نے خدا کی موت کا اعلان کیا، تو اقبال کو نیٹشے جیسے مفکر کی کم فہمی پر سخت افسوس ہوا چناں چہ کہا

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

ابلیس کو مختلف زمانوں میں مختلف مفکرین، مذہبی رہنماؤں اور شعرا نے کئی طرح سے پیش کیا ہے۔ قدیم ایرانی مفکرین زرتشت، مانی اور مزدک کے مطابق دنیا میں دو فعال قوتیں ہیں۔ یزداں اور اہرمن۔ مانی نے البتہ اس کردار پر خاصی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد دانتے، ملٹن، گوئٹے اور نیٹشے کے ہاں بھی اس کردار کے دلچسپ پہلو سامنے آتے ہیں۔ اقبال کے ہاں ابلیس کا کردار زیادہ تر گوئٹے سے مماثل دکھائی دیتا ہے۔ لیکن ہر تصور کی طرح اقبال نے اس قدیم تصور میں بھی نئے اضافے کیے ہیں۔ سلیم احمد کے بہ قول:

''اقبال کے شیطان کے بارے میں حرف آخر خود اقبال ہی نے کہا ہے۔ اقبال کا شیطان پر قوت ہے، باعمل ہے، شدید

اور ہیجان پرور جذبات کا مالک ہے۔یعنی اس میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو زندگی کا حاصل ہیں، جن کے بغیر زندگی موت بن جائے۔لیکن اس کے باوجود وہ شیطان ہے اور شکست اس کا مقدر ہے۔اس کی وجہ کیا ہے؟ اقبال ہمیں بتاتے ہیں کہ شیطان میں قوت، توانائی، عمل، حرکت اور اضطراب، سبھی کچھ ہے مگر اس کے پاس کوئی ایسا اصول تنظیم نہیں ہے جس سے وہ اپنی صلاحیتوں کو منظم کر سکے، انہیں ایک سانچے میں ڈھال سکے۔"[۸]

مرید ہندی آخری دم تک اپنے پیر و مرشد رومی کے سحر میں گرفتار رہے۔حکیم محمد حسین عرشی امرتسری کے نام مارچ ۱۹۳۵ء میں لکھے گئے ایک خط میں لکھا ہے کہ "میں ایک مدت سے مطالعہ ترک کر چکا ہوں۔اگر کبھی کچھ پڑھتا ہوں تو صرف قرآن یا مثنوی معنوی۔" مثنوی معنوی ۲۷ ہزار اشعار پر مشتمل ایک معرکتہ الآراشاہ کار ہے اور دنیا بھر کی چندگنی چنی تصانیف میں اس کا شمار کیا جاتا ہے۔اقبال رومی کی قامت سے آگاہ تھے چناں چہ اپنے کلام میں بارہا رومی کے قصیدے لکھتے دکھائی دیتے ہیں ::

پیر رومی خاک را اکسیر کرد — از غبارم جلوہ ھا تعمیر کرد

صحبت پیر روم سے مجھ پر ہوا یہ راز فاش — لاکھ حکیم سر بہ جیب ایک کلیم سر بہ کف

علاج آتش رومی کے سوز میں ہے ترا — تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

اقبال نے اپنی مثنویاں رومی کے طرز و بحور میں لکھیں۔کئی غزلیں بھی ان کی زمینوں میں کہی۔لیکن جو خاصیت رومی کی اقبال کو بہت زیادہ مرغوب تھی، وہ ان کا تصور عشق ہے۔ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کے بہ موجب:

"رومی کے ہاں عشق بڑے وسیع معنی رکھتا ہے اور اقبال کے ہاں بلا مبالغہ اس سے بھی وسیع تر۔دونوں کے نزدیک عشق اک ایسی قوت ہے جو کائنات کے ذرے ذرے میں جاری و ساری ہے اور اس سے محیر العقول کارنامے وجود میں لائے جا سکتے ہیں۔۔۔اقبال کے تصور خودی کا لازمی عنصر یہی عشق ہے۔رومی اور اقبال دونوں کے نزدیک اس کائنات میں کارزار حیات کی سرگرمیوں کا اہم عنصر 'عشق' ہے۔"[۹]

"پیام مشرق" سے لے کر "ارمغان حجاز" تک اقبال کے ہاں جو فلسفہ شد و مد کے ساتھ دکھائی دیتا ہے وہ مارکسیت ہے۔"ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں کارل مارکس کی شان میں لکھتے ہیں : :

وہ کلیم بے تجلی، وہ مسیح بے صلیب — نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب

اقبال کی کئی منظومات جیسے "لینن خدا کے حضور میں"، "فرمان خدا (فرشتوں سے)"، "خضر راہ"، "نوائے

مزدور''،''الارض للہ''،''بلشو یک روس''،''کارل مارکس کی آواز''وغیرہم میں اقبال کے اشتراکی خیالات بہ آسانی ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔ان کے ہاں سرمایہ داری سے نفرت اور محنت کش طبقے سے محبت کے جذبات تواتر سے ملتے ہیں :

بندہ مزدور کو جا کر میرا پیغام دے — خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر — شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تری برات
اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے — مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی — اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

اس میں شک نہیں ہے کہ اس فلسفے نے دنیا بھر کے اہم اذہان کو متاثر کیا۔اقبال بھی اس کی خوبیوں کے مدح سرا رہے۔ان کے نزدیک اشتراکیت کا وصف خاص یہ ہے کہ اس نے فرنگی تہذیب کی لعنتوں بالخصوص ملوکیت، سرمایہ داری اور نسلی تعصبات کا خاتمہ کر دیا۔یہی وجہ ہے کہ ان پر اشتراکی ہونے کا بھی الزام لگایا گیا لیکن اقبال کی فکر کا بنیادی مرکزہ اسلام ہے۔وہ اس فلسفے کی توضیحات بھی اسلام کی ذیل میں پیش کرتے ہیں۔ان کے مطابق اسلام خود مساوات کا مذہب ہے۔اسلام خود ایک ہمہ گیر اشتراکی جمہوری نظام ہے۔اپنے ایک خط میں لکھا ہے''میرے نزدیک فاشزم یا کمیونزم اور زمانہ حال کے اور''ازم''کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔میرے عقیدے کی رو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو بنی نوع انسان کے لیے ہر نقطہء نگاہ سے موجب نجات ہوسکتی ہے۔''درحقیقت اقبال تمام عمر اسلام کے اصل پیغام اور حقیقی روح کے ابلاغ اور نشر و اشاعت میں کوشاں رہے۔انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے اسلام کے احیا کی بھرپور سعی کا فریضہ انجام دیا۔اس پیغام کو بیسویں صدی کے انسان کے لیے قابل قبول بنانے کے لیے انہوں نے دنیا کے تمام دانش وروں سے استفادہ کیا اور اپنی مطالب کے افکار اخذ کیے لیکن جو بھی فکر،تحریک یا ثقافت اسلامی روح کے منافی دیکھی اس کے رد و تردد میں کسی تامل سے کام نہیں لیا۔وہ مسلمان قوم کو ہر طرح کے غیر اسلامی خیالات و تصورات کی ملاوٹ سے پاک دیکھنا چاہتے تھے۔ان کی شاعری غیر اسلامی تصورات کی ذیل میں رد تشکیل تھیوری کے استعمال کی بہترین مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے۔یہی اقبال کی شخصیت اور شاعری کی سب سے بڑی خوبی ہے۔آخر میں اس مؤقف کی دلیل میں یہ رائے درج ہے کہ اقبال کا شخصی و شعری انفراد بہ ہر صورت اپنی جگہ قائم رہا اور کسی بھی بڑے فلسفی یا شاعر کے نظریات ان کے ذاتی مؤقف اور عقائد کو متزلزل کرنے میں ناکام رہے۔پروفیسر محمد منور کے مطابق:

"توازن کا احساس علامہ اقبال کے افکار و اشعار کا ایک اہم پہلو ہے۔ چناں چہ وہ ہر نظام فکر اور فلسفے کی اچھی چیزوں پر بھی نگاہ رکھتے تھے اور بری چیزوں پر بھی۔ مثلاً وہ جمہوریت کی اچھی باتوں کے قائل ہیں مگر جب وہ استعماری روپ دھارتی ہے یا دو صد مغز خر کے شمار ہی کو معیار دانش قرار دے لیتی ہے تو وہ اسے معاف نہیں کرتے۔ وہ اشتراکیت کی اچھی باتوں کی تعریف کرتے ہیں مگر اس کی خدا ناشناسی اور احترام روح آدمیت سے ناآگاہی پر سخت نکتہ چینی کرتے ہیں۔ مسولینی کی شخصیت سے بہت متاثر تھے مگر جب اس نے حبشہ کو پامال کیا تو علامہ اقبال نے مسولینی پر بھی اور اس سارے تمدن پر بھی لعن طعن کی، جس نے یورپ کی استعماری اور فسطائی روح کو جن دیا۔ ان کی "خودی" کو "بے خودی" کا سہارا میسر ہے۔ ان کا "شکوہ" بھی تنہا نہیں رہا، اسے بھی "جواب شکوہ" نے تقویت دے دی۔ ان کے یہاں آزادیٔ افکار کی احتیاج ہے۔" [۱۰]

الغرض اقبال دنیائے شعر و ادب میں اپنے طرز کی واحد مثال ہیں۔ انہوں نے دنیا بھر کے شعر و ادب و فلسفہ کا بنا کسی تعصب و تنگ نظری کے عمیق مطالعہ کیا۔ ان میں سے اکثر افکار کو بنا کسی تردد کے اپنی فکر میں جگہ دیا اور کچھ کو معمولی رد و بدل سے اپنی فکر کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔ لیکن ان کا اصل کمال یہ ہے کہ انہوں نے دنیا کے عظیم افکار میں اپنا خصوصی اور منفرد حصہ ڈالا۔ یوں اپنے طرز کی ایک بالکل انوکھی شاعری کا بے مثال ماڈل پیش کیا۔ یہ شاعری ایک ایسے پیغام کی حامل ہے جس کی بنیاد حرکت و عمل پر رکھی گئی ہے چناں چہ اس کی تعبیر و تفہیم پر کبھی جمود طاری نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کے دنیا کی تمام اہم زبانوں میں تراجم ہو رہے ہیں اقبال سے استفادے کا یہ سلسلہ تادیر جاری رہنے کے امکانات روشن ہیں۔ جیسا کہ ابتدا میں ذکر کیا گیا کہ اقبال کی شعری شخصیت پر پچھلی ایک صدی میں بیش بہا کام ہو چکا ہے۔ ان کی فکر کو اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ گرفت میں لینے کی کئی اہم کاوشیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ اب کسی بھی مختصر مقالے میں اقبال کی فکر کے کسی اہم رخ کو مکمل واضح کرنا ممکن نہیں رہا۔ اس مختصر مقالے میں بھی محض طالب علمانہ کاوش کی گئی ہے کہ اقبال کی اس مضبوط فکری بنیاد کو واضح کیا جا سکے جس پر ان کی عظیم شعری عمارت قائم و دائم ہے۔ اقبال کا تمام تر علمی استفادہ اس حد تک اہمیت کا حامل ضرور رہا ہے کہ ان کے مطالعے کی وسعت پر دلالت کرتا ہے لیکن یہ مطالعہ ان کے ذاتی انفراد اور نظریات کو کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچا سکا۔ وہ اپنی نظریات کی اصل روح سے کامل آگاہی رکھتے تھے۔ لہٰذا اپنی مضبوط فکری بنیاد کو ہر طرح کی ملاوٹ سے بچایا۔ دنیا بھر کی دانش کا مطالعہ، اپنے نظریات کی بہتر پیش کش اور وضاحت کے لیے دلیل کی حد تک استعمال کیا۔ درحقیقت اقبال کی

اصل شان اسی نکتے میں ہے کہ ان شاعری خالصتاً ان کے اپنے نظریات کی پرچارک ہے اس پر کسی دوسرے کی مہر ثبت نہیں کی جاسکتی۔

حوالہ جات:

۱۔ راشد حمید، ڈاکٹر، اقبال کا تصورِ تاریخ، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ص ۱۸۱

۲۔ یوسف ظفر: ''اقبال کا تدریجی ارتقا''، مشمولہ فکر و فن اقبال، مرتبہ شگفتہ زکریا، ڈاکٹر، لاہور، سنگت پبلشرز، ۲۰۰۴، ص ۵۴۔

۳۔ علی عباس جلال پوری: ''اقبال کا علم الکلام''، جہلم، خرد افروز، ۱۹۸۷، ص ۱۳۳۔

۴۔ رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر: ''اقبال کا تصور زمان و مکان اور دوسرے مضامین''، لاہور، بزم اقبال، ۱۹۷۳، ص ۱۲۸۔ ۱۲۹۔

۵۔ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر: ''فروغ اقبال''، ص ۳۶، ۳۷۔

۶۔ ضمیر علی بدایونی: ''مابعد جدیدیت کا دوسرا رخ''، کراچی، شہرزاد، ۲۰۰۶، ص ۱۷۶۔

۷۔ احمد میاں اختر جوناگڑھی، قاضی: ''اقبالیات کا تنقیدی جائزہ''، کراچی، اقبال اکیڈیمی، ۱۹۶۵، ص ۱۰۱۔ ۱۰۲۔

۸۔ سلیم احمد: ''اقبال ایک شاعر''، لاہور، کتاب گھر، ۱۳۹۸ھ، ص ۱۱۰۔

۹۔ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر: ''فروغ اقبال''، لاہور، اقبال اکیڈیمی، ۱۹۹۶، ص ۵۳۱۔

۱۰۔ محمد منور، پروفیسر، توازن: اقبال کی شاعری کا ایک اہم پہلو، مشمولہ، اقبالیات کے سو سال (منتخب مضامین)، مرتبین، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، محمد سہیل عمر، ڈاکٹر وحید عشرت، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ص ۱۸۸

***

تفہیمِ اقبال کے حوالہ سے دو خط

*ڈاکٹر مصطفیٰ حیدر زیدی

Two letters with reference to the understanding of Iqbal

Dr. Mustafa Haidar Zaidi

There is a strong tradition of letter writing in the Persian language in the context of scholarly and mystical discourse. When Mirza Ghalib introduced a trend to write"letter″ in the form of"dialogue″, the letters of scholars(مشاہیر) became a genre in Urdu letter writing, among them the letters of Allama Iqbal are of great significance. After this, many scholars have also adopted the genre of imaginary letter writing to present their arguments. The best example of imaginary letter writing in contemporary times is the letters of Mr. Anwar Maqsood, which he wrote to himself on behalf of Ghalib, Iqbal, Patras, Manto, Ahmed Faraz, John Elia and Quaid-e-Azam.The article under review consists of two letters and is also a continuation of the same imaginary letter writing. The first letter is a tribute to author's teacher and former Principal of Oriental College Lahore, Dr. Akram Shah. In this letter, the brief address of Dr. Akram Shah(late(delivered during the"Iqbal Pakistan Conference″ 2021 is also transcribed which was his last address at any event. This letter is a memoire of the author and a description of his state of heart to his teacher. The second letter has been written by Allama Iqbal to the author. Most of this letter consists of excerpts from various letters of Allama Iqbal. An attempt has been made to convey some facts

* اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ فارسی اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور

to the readers of Iqbal. At the same time this letter addresses the difficulties faced by a common reader in understanding Iqbal's point of view. In some places, some difficult words from excerpts of Iqbal's letters have been replaced with synonyms to clarify their meaning so that even an ordinary reader can access its meanings. These changed words have been underlined to mark the readers.

دو خط [تعارف: علمی و عرفانی مباحث کے حوالہ سے فارسی زبان میں صوفیہ کے ہاں مکتوب نگاری کی مضبوط روایت ملتی ہے۔ مرزا غالبؔ نے "مراسلہ" کو "مکالمہ" بنایا تو اردو مکتوب نگاری میں مشاہیر کے خطوط کو ایک صنف کی حیثیت حاصل ہوگئی، جن میں مکتوباتِ اقبال خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے بعد کئی احباب نے فرضی مکتوب نگاری کو بھی اپنا مدعا پیش کرنے کا وسیلہ بنایا ہے، جس کی دورِ حاضر میں بہترین مثال جناب انور مقصود صاحب کے فرضی خطوط ہیں جو انہوں نے غالب، اقبال، پطرس، منٹو، احمد فراز، جون ایلیا اور قائدِ اعظم کی جانب سے اپنے آپ کو تحریر کیے۔ زیرِ نظر "دو خط" بھی اسی فرضی خط نگاری کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ پہلا خط راقم کی جانب سے اپنے استادِ محترم اور اورینٹل کالج کے سابق پرنسپل ڈاکٹر اکرم شاہ صاحب کے نام، انہیں خراج عقیدت ہے۔ اس خط میں مرحوم استادِ محترم کا "اقبالِ پاکستان" کانفرنس 2021ء سے مختصر خطاب بھی قلم بند کر دیا گیا ہے، جو کسی بھی تقریب سے ان کا آخری خطاب تھا۔ یہ خط راقم کی یادنگاری اور اپنے استاد سے، دل کے احوال کا بیان ہے۔ دوسرا خط علامہ اقبال کی جانب سے راقم کو لکھا گیا ہے۔ اس خط کا بیشتر حصہ علامہ اقبال کے مختلف خطوط کے اقتباسات پر مشتمل ہے۔ جس میں چند معروضات اقبال پڑھنے والوں تک پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ساتھ ہی اس خط میں اقبال فہمی میں ایک عام قاری کو پیش آنے والی مشکلات کو علامہ اقبال کے نکتہ نظر سے بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بعض جگہوں پر اقبال کے خطوط کے اقتباسات میں چند مشکل الفاظ کو، ان کا مفہوم واضح کرنے کے لیے، مترادفات سے بدل دیا گیا ہے تا کہ ایک عام قاری بھی اس خط کے مدعا تک رسائی پا سکے! قارئین کی نشان دہی کے لیے ان تبدیل شدہ الفاظ کو خط کشیدہ کر دیا گیا ہے]

(پہلا خط)

استادِ مکرم السلام علیکم!

اگرچہ کئی برس سے آپ کے ساتھ براہِ راست رابطہ نہ ہو سکا لیکن بندہ آپ کا ممنونِ احسان ہے کہ اکتوبر 2021ء

میں شعبہ فارسی اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور نے" اقبال پاکستان" کانفرنس کا انعقاد کیا تو ضعیف العمری اور شدید علالت کے باعث اگرچہ آپ زیادہ گفتگو بھی نہ کر پاتے تھے لیکن آپ نے ہماری محبت کا پاس رکھتے ہوئے اس کانفرنس میں شرکت فرمائی اور ٹیلی فون پر مختصر خطاب بھی کیا۔ اپنی مختصر گفتگو میں آپ نے فرمایا: "علامہ زندگی کے شاعر ہیں۔ وہ ہر چیز میں عصری قوت کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ ملتِ اسلام کو صدیوں سے جو چیلنج درپیش ہے، اقبال اس حوالہ سے بہت حساس ہیں۔ وہ ہمیں پیغام دیتے ہیں کہ ہم اپنا کردار ادا کریں اور نبی کریمؐ کی سیرت کو دیکھیں کہ آپؐ نے چند سالوں میں دنیا کا سب سے بڑا انقلاب برپا کر دیا۔ اقبال نے ہمیں جو پیغام دیا، وہ عمل کا پیغام! اسلام کا پیغام! اور نبی کریمؐ سے محبت کا پیغام ہے اور اسی سے ہماری زندگی بن سکتی ہے۔ اسی لیے علامہ اقبال صرف شاعر نہیں ہیں بلکہ وہ ہمارے رہنما قرار پاتے ہیں اور ان کی رہنمائی درحقیقت قرآن پاک کی رہنمائی ہے" ہمیں یاد ہے کہ دورانِ گفتگو آپ بار بار علامہ اقبال کا یہ شعر دہراتے رہے:

یہ گھڑی محشر کی ہے، تو عرصۂ محشر میں ہے　　پیش کر غافل! عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

۲۰ اگست ۲۰۲۲ء کو آپ کی وفات کی خبر سن کر دل نہایت ملول ہوا اور رہ رہ کر ذہن میں آپ کے لب ولہجہ میں، علامہ اقبال کے اشعار گونجنے لگے۔ ۳۱ اگست کو شعبہ فارسی نے آپ پر تعزیتی سیمینار منعقد کرایا تو ذہن ماضی کے پردوں کو چاک کرنے لگا اور مجھے انٹرمیڈیٹ کا وہ دور یاد آیا، جب مرزا غالب پر بنی ڈرامہ سیریل دیکھ کر مجھے پہلی مرتبہ دیوانِ غالب پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ مرزا کی غزل نے اس قدر متاثر کیا کہ دیوانِ غالب کی بیسیوں غزلیات اور بیش از نصف دیوان زبانی یاد ہو گیا۔ مرزا غالب کی بلند خیالی اور عالی ہمتی نے دل و دماغ پر ایسا اثر چھوڑا کہ دل کی مسند پر غالب کے علاوہ کوئی اور شاعر نہ بیٹھ سکا۔ اکثر یہ خیال آتا کہ اللہ نے ہمیں مرزا کے دور میں پیدا کیوں نہ کیا؟ کہ اس صورت میں ہم بھی یقیناً مرزا کے شاگرد ہوتے! پھر قسمت کا کرنا یوں ہوا کہ بی اے میں گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا، جہاں کے علمی و ادبی ماحول نے ذہن کی خوب آبیاری کی۔ ہماری خوش بختی کہ گورنمنٹ کالج میں ایم اے فارسی کے دوران، اقبالیات کا مضمون پڑھانے کے لیے ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب کو مقرر کیا گیا جو اس وقت تک جی سی لاہور سے عربی کے پروفیسر کے طور پر ریٹائر ہو چکے تھے اور ہفتہ میں دو روز بہ طور جز وقتی استاد ہمیں پڑھانے تشریف لاتے تھے۔ اگرچہ میں اس وقت تک اقبال کی اردو شاعری کی چاروں کتب پڑھ چکا تھا لیکن دیوانِ غالب کے مقابلہ میں اقبال نے کچھ خاص متاثر نہ کیا۔ ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب سے اقبال کے فکری موضوعات پڑھے تو اندازہ ہوا کہ علامہ اقبال کی فکر اور مدعا سے آگاہی

تو ان کی فارسی شاعری پڑھے بغیر ناممکن ہے اور جس اقبالؔ کو ہم اس کی اردو شاعری کی بدولت جانتے ہیں اور کافی باتوں کے حوالہ سے تشکیک کا شکار ہوتے ہیں، فارسی شاعری کا اقبالؔ اس سے بہت زیادہ درخشاں اور قد آور ہے۔ اب دل کی مسند پر غالب کے ساتھ اقبال بھی جا گزیں تو ہو گئے لیکن ابھی دل کو مکمل تسلی نہ ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ دورانِ لیکچر، میں نے رضوی صاحب سے سوال کیا کہ غالبؔ اور اقبالؔ میں سے آپ کس کو بڑا شاعر گردانتے ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا: ''دو مختلف ادوار کے شعراء کا آپس میں موازنہ کرنا انصاف نہیں ہے۔ جیسے غالب کے سامنے میؔر کا کلام تھا لیکن میؔر کے سامنے غالب کا کلام نہیں تھا۔ اسی طرح اقبال کے سامنے غالبؔ اور میرؔ کا کلام تو تھا لیکن غالب اور میر کے سامنے اقبال کا کلام نہیں تھا۔ غالب اپنے تخیل میں بہت بلند مقام پر کھڑے ہیں اور سب سے زیادہ quotable شاعر ہیں۔ غالب کے کئی مصرعے ضرب المثل بن چکے ہیں اور سینکڑوں کتابوں کے نام غالب کے اشعار یا ترکیبات پر رکھے گئے ہیں اور سب سے زیادہ quotable ہونے کا مطلب ہے کہ غالب نے ہر دل کا حال کہا ہے۔ لیکن علامہ اقبال کا مقام الگ ہے، وہ ایک بلند آدرش کو پیش کرنے والے شاعر ہیں!

دورانِ ایم فل قسمت نے ایک بار پھر یاوری کی اور ہمارے اساتذہ نے ہمیں بتایا کہ آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کو اقبالیات کا مضمون اورینٹل کالج کے سابق پرنسپل اور ماہرِ اقبالیات ڈاکٹر اکرم شاہ صاحب پڑھائیں گے۔ اگرچہ آپ کے ساتھ اپنے اساتذہ کے ہم راہ چند ملاقاتیں پہلے بھی ہو چکیں تھیں اور آپ کے علمی کمال کا کچھ کچھ اندازہ بھی تھا لیکن جب آپ سے اقبالیات کا مضمون پڑھا تو دل کرتا تھا کہ کلاس ختم ہی نہ ہو! جس طرح آپ نے ہمیں اقبال کا کلام اور اس کی فکری جہات پڑھائیں اور جس طرح اقبال کو کلیت میں سمجھنے پر زور دیا آج بھی آپ کے لیکچر کانوں میں گونجتے ہیں۔ جس جوش اور جذبہ سے آپ اقبال کے اشعار بیان کرتے، وہ اشعار ہمارے دل میں پیوست ہو جاتے۔ ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب کے بعد آپ سے اقبالیات پڑھنا گویا سونے پر سہاگہ تھا۔ یہ یقیناً آپ اساتذہ کا فیضانِ نظر تھا کہ اس کے بعد ہم اقبالیات پڑھنے کے قابل ہوئے کیونکہ اقبال کے حوالہ سے قاری جن مخمصوں کا شکار ہوتا ہے، وہ دور ہو گئے اور یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ اقبال کا مدعا سمجھے بغیر، کلامِ اقبال سمجھنا اور اس کی تہوں تک پہنچنا، ناممکن ہے۔ لیکن اکثر اوقات یہ خیال دل میں آتا ہے کہ اگر علامہ صاحب سادہ اور آسان زبان میں شاعری کرتے تو لوگوں تک ان کا مدعا آسانی سے پہنچ سکتا تھا! اس سے بڑھ کر اور کیا ستم ہو گا کہ ہم علامہ صاحب کو'' شاعرِ مشرق''، ''مصورِ پاکستان'' اور'' قومی شاعر'' کہہ کر یاد تو کریں لیکن ان کی فکر سے نا آشنا ہوں؟

آپ جانتے ہیں کہ میں ڈاکٹریٹ کے لیے اقبال پر تحقیقی مقالہ لکھنا چاہتا تھا اور گورنمنٹ کالج کے اساتذہ نے مجھے کہا تھا کہ اگر آپ شاہ صاحب کو بہ طور استاد رہنما راضی کر لیں تو آپ کو میرا نگران مقرر کر دیا جائے گا۔ مجھے وہ دن بھی بارہا یاد آیا جب میں آپ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کی کہ آپ مجھے اقبال پر پی ایچ ڈی کا تھیسز کروائیں! تو آپ نے یہ کہہ کر معذرت کر لی تھی کہ میں 74 سالہ بندہ ہوں اور 'دائرۂ معارف اقبال' جیسے ضخیم کام کی تکمیل میں مصروف ہوں۔ دوسرے اقبال پر اب تک ہزاروں کتب لکھی جا چکی ہیں اور آئے دن کوئی نئی کتاب سامنے آتی رہتی ہے۔ اس لیے یہ خدشہ بھی ہے کہ آپ کا تھیسز مکمل کرنے کے دوران اگر آپ کے مجوزہ موضوع کے حوالہ سے کوئی کتاب لکھی گئی تو آپ کا کام رائیگاں جائے گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ آپ اقبال کے علاوہ کسی اور موضوع پر پی ایچ ڈی کر لیں۔ اُس وقت آپ کے ساتھ تشریف فرما ڈاکٹر ظہور الدین احمد نے مجھے "تاریخ نویسی در دورۂ تیموریان متاخر" سمیت چند دیگر موضوعات عنایت کیے اور پھر یہی میرا موضوعِ تحقیق قرار پایا تھا۔

لیکن دل آج اس لیے بھی آپ کو شدت سے یاد کر رہا ہے کہ اس ماہِ نومبر شعبہ فارسی ایک لیکچر سیریز کرانا چاہتا تھا جس میں اقبال کی ایک فارسی کتاب پر روزانہ لیکچر کے ساتھ اقبال کے اشعار کی کیلی گرافی اور اقبال کی ایک نظم کی ڈرامائی پیش کش بھی مجوزہ پروگرام کے آخری روز کی تقریبات میں شامل تھیں۔ یونیورسٹی کے ایک استاد سے اس سلسلہ میں ذکر ہوا کہ کہیں ہمارا اور ان کا پروگرام ایک ہی تاریخوں میں متصادم نہ ہو جائے تو انہوں نے فرمایا کہ یونیورسٹی میں اقبال پر پروگرام کروانے کا حق ہمارے علاوہ کسی کو نہیں اور اگر کوئی پروگرام کروانا چاہتا ہے تو ہمارے اشتراک کے بغیر نہیں کروا سکتا! آپ اس پروگرام کے آرگنائزر میں ہمارا نام بھی شامل کریں ورنہ میں اس پر احتجاج کروں گا اور پروگرام بھی نہیں ہونے دوں گا۔ ہمارا شعبہ یہ پروگرام چونکہ پہلے ہی دو تنظیموں کے اشتراک و تعاون سے کروا رہا تھا۔ سو میں نے افسر بالا کو اس بابت مطلع کیا۔ انہوں نے کہا کہ اقبال پر پروگرام کروانا سب کا حق ہے! آپ پروگرام کا پروپوزل بنا کر بھیجیں اور پروگرام کروائیں! لیکن جب اس پروگرام کا پروپوزل بنا کر بھیجا گیا تو افسرِ بالا نے یہ کہہ کر اسے رد کر دیا کہ آپ اپنے شعبہ کی سطح پر کوئی "چھوٹا موٹا" پروگرام کرا لیں۔

گزشتہ برس سے ایک صاحبِ دل کے کہنے پر، اپنے غریب خانہ پر علامہ اقبال پر ہفتہ وار لیکچر کا سلسلہ شروع کیا تو چند پڑھے لکھے اور سنجیدہ احباب نے وہاں شرکت کی۔ ان احباب کی ذہنی و فکری رسائی دیکھ کر طے پایا کہ اقبال کا فلسفۂ خودی جو اس کا بنیادی فلسفہ ہے، ثانوی مآخذ یا حوالہ جاتی کتب سے پڑھنے کے بجائے بنیادی مآخذ یعنی "اسرار

خودی" سے ہی پڑھا جائے تا کہ معلوم تو ہو کہ یہ 'خودی ※ آخرکس' چیستان ※ کا نام ہے؟ بہاولپور علم و ادب کا امین شہر ہے۔ یہاں اس سلسلۂ درس کو پذیرائی ملی اور احباب نے اس میں ذوق وشوق سے شرکت کی۔ اسرارِ خودی ختم کرنے کے بعد اس کا تکملہ یعنی رموزِ بے خودی کی تدریس جاری ہے جو اختتام کی جانب گامزن ہے۔ اس کے بعد اگر اللہ نے توفیق دی تو" پس چہ باید کرد! اے اقوامِ شرق" پڑھنے کا ارادہ ہے۔

زیادہ کیا عرض کروں؟ دعاؤں کی درخواست کے ساتھ اجازت چاہوں گا۔ علامہ صاحب اور مرزا غالبؔ کی خدمت میں سلام عرض کیجیے گا!

نیاز مند! مصطفی زیدی

(دوسرا خط)

برخوردار زیدی طال عمرک!

ابھی اکرم شاہ نے مجھے اور مرزاؔ کو تمہارا سلام پہنچایا۔ یہ جان کر دلی مسرت ہوئی کہ تم اسرار و رموز پڑھ اور پڑھا رہے ہو اور تمہیں براہِ راست خط لکھنے کی علت بھی یہی ہے کیونکہ یہ دونوں کتابیں میں نے اپنے خونِ جگر سے تحریر کی ہیں۔! میں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کی گزشتہ ذہنی تاریخ اور موجودہ حالت پر بہت غور کیا جس سے مجھے یقین ہو گیا کہ ان دونوں قوموں کے اطبا کو اپنے مریض کا اصلی مرض ابھی تک معلوم نہ ہو سکا۔ میرا عقیدہ ہے کہ ان کا اصلی مرض قوائے حیات کی ناتوانی اور ضعف ہے اور یہ ضعف زیادہ تر ایک خاص قسم کے ادبیات کا نتیجہ ہے، جو ایشیا کی بعض قوموں کی بدنصیبی سے ان میں پیدا ہو گیا ہے۔ جس نکتۂ خیال سے یہ قومیں زندگی پر نگاہ ڈالتی ہیں، وہ نکتۂ خیال صدیوں سے، مضعف مگر حسین وجمیل، ادبیات سے محکم ہو چکا ہے (۱)۔ 'افسوس ہے مسلمان مردہ ہیں۔ انحطاطِ ملی نے ان کے تمام قویٰ کو شل کر دیا ہے۔ انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے صید پر ایسا اثر ڈالتا ہے، جس سے انحطاط کا مسحور، اپنے قاتل کو اپنا مربی تصور کرنے لگ جاتا ہے، یہی حال اس وقت مسلمانوں کا ہے (۲)۔ شعرائے عجم میں سے کسی نے ایک خیال رقم کیا ہے کہ 'شہیدِ جہاد' اور 'شہیدِ عشق' دونوں برابر کہاں ہو سکتے ہیں؟ کہ پہلا تو دشمن کے ہاتھ سے مارا گیا ہے اور دوسرا دوست کے ہاتھ سے۔ 'یہ رباعی شاعرانہ اعتبار سے نہایت عمدہ اور قابلِ تعریف ہے۔ مگر نظرِ انصاف سے دیکھیے تو جہادِ اسلامی کی تردید میں اس سے زیادہ دلفریب اور خوبصورت طریق اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ شاعر نے کمال یہ کیا ہے کہ جس کو اس نے زہر دیا ہے اس کو اس امر کا احساس بھی نہیں ہو سکتا کہ مجھے کسی نے زہر دیا ہے بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ مجھے آبِ حیات پلایا گیا ہے۔ آہ!

مسلمان کئی صدیوں سے یہی سمجھ رہے ہیں (۳)۔

تمہیں معلوم ہے کہ جب میں نے نظم شکوہ لکھی تو ملاؤں نے مجھے کافر وملحد قرار دیا۔ خیر! جوابِ شکوہ لکھنے کے بعد حالات کچھ بہتر ہوئے۔ پھر اسرارِ خودی کی اشاعت پر، صوفیانہ حلقوں کی جانب سے بہت تنقید ہوئی۔ جس کی بڑی وجہ تو دیباچے میں حافظ شیرازی کی شاعری پر تنقید تھی حالانکہ وہ حافظ شیرازی کی ذات پر نہیں بلکہ ایک لٹریری نصب العین پر تنقید تھی جو مسلمانوں میں کئی صدیوں سے پاپولر تھا۔ (۴) اس میں دیباچے کی بحث ایک الگ بحث تھی جس میں وحدۃ الوجود کا مسئلہ ضمناً آ گیا تھا۔ (۵) اصل بات یہ ہے کہ صوفیہ کو 'توحید' اور 'وحدت' کا مفہوم سمجھنے میں سخت غلطی ہوئی ہے۔ یہ دونوں اصطلاحیں مترادف نہیں بلکہ پہلی کا مفہوم خالص مذہبی ہے اور دوسری کا مفہوم خالص فلسفیانہ ہے۔ 'توحید' کے مقابلہ میں یا اس کی ضد لفظ 'کثرت' نہیں جیسا کہ صوفیہ نے تصور کیا ہے بلکہ اس کی ضد 'شرک' ہے اور 'وحدت الوجود' کی ضد 'کثرت' ہے (۶)۔ 'مگر عوام اس باریک امتیاز کو نہ سمجھ سکے اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس پر بڑی لے دے ہوئی۔ اگر لٹریری اصول یہ ہو کہ حُسن، حُسن ہے، خواہ اس کے نتائج مفید ہوں خواہ مضر! تو خواجہ حافظ دنیا کے بہترین شعرا میں سے ہیں (۷)۔ 'میرے نزدیک حافظ کی شاعری نے بالخصوص اور عجمی شاعری نے بالعموم مسلمانوں کی سیرت اور عام زندگی پر نہایت مذموم اثر کیا ہے۔ اسی واسطے میں نے ان کے خلاف لکھا۔ مجھے امید تھی کہ لوگ مخالفت کریں گے اور گالیاں دیں گے لیکن میرا ایمان گوارا نہیں کرتا تھا کہ حق بات نہ کہوں (۸)۔

'میری غرض شاعری سے زبان دانی کا اظہار یا مضمون آفرینی نہیں، نہ میں نے آج تک اپنے آپ کو شاعر سمجھا ہے۔ حقیقت میں فن شاعری اس قدر دقیق اور مشکل ہے کہ ایک عمر میں بھی انسان اس پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ میرا مقصود گاہ گاہ نظم لکھنے سے صرف اسی قدر رہا کہ چند مطالب جو میرے ذہن میں تھے، ان کو مسلمانوں تک پہنچا دوں اور بس (۹) فلسفۂ حیات کے بارے میں' میں جس نتیجے پر پہنچا وہ نتیجہ بیش تر اقوام مشرق کے موجودہ ذوق اور میلانِ طبیعت کے خلاف ہے لیکن مشرقِ قدیم کے حکما اس سے نا آشنا نہیں تھے اور یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ میں اس نتیجے پر پہنچنے میں فلاسفۂ مغرب سے متاثر ہوا ہوں (۱۰)۔ یہ مثنویاں لکھنے سے میری غرض یہ تھی کہ اُس حقیقی اسلام کو آشکار کروں جس کی اشاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے ہوئی۔ (۱۱) میں نے فلسفۂ حیات پر بہت غور کیا تو اس کے دو بنیادی اجزاد یکھے، اولاً فرد اور ثانیاً معاشرے کی سطح پر اور ان دونوں کو بالترتیب "خودی" اور "بے خودی" کے ذیل میں بیان کیا۔ فلسفۂ خودی کا 'فرد'، فلسفۂ بے خودی کے 'معاشرے' کے ساتھ مل کر ہی مکمل ہوتا ہے۔ 'رموزِ بے

خودی، دراصل فلسفۂ مدنیت ہے اور یہی فلسفۂ مدنیت اسلام کا مقصود ہے۔ جو نوجوان صرف فلسفۂ خودی پڑھتے ہیں، وہ میرا فلسفۂ حیات سمجھ نہیں پاتے اور پھر وہ خودی سے مراد اپنی ذات، غرور و انانیت یا زیادہ سے زیادہ خود داری ہی سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن آہ زیدی! قوم کے اُن جوانوں سے کیا شکوہ کروں جو مجھے برقی ذرائع ابلاغ پر گردش کرتے ان اشعار کے حوالہ سے جانتے ہیں، جو میرے ہیں ہی نہیں؟ اور یہ اسی قبیل کے بے وزن اشعار ہیں، جن کے بارے میں مرزا غالب فرماتے تھے کہ مجھے دُرّوں کی مانند لگتے ہیں۔

برخوردار! تم دیکھو گے کہ مملکتِ خداداد کے ہر سکول کی دیوار پر میرے اشعار تحریر ہوتے ہیں اور تقریر اور مضمون نویسی کے اکثر مقابلہ جات میں، میرے مصرعے بہ طور عنوان دیے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میرے پندرہ بیس اشعار تو ہر کسی کو یاد ہوتے ہیں اور اگر کسی موصوف کو میرے سوڈیڑھ سو اشعار ازبر ہو جائیں تو وہ اقبال شناسی کا مدعی بن جاتا ہے اور اس چیز کو یکسر فراموش کر دیتا ہے کہ میرا کلام محض شاعرانہ تلذذ کے لیے نہیں بلکہ مقصدِ حیات پہچاننے اور عملی زندگی میں مشعل راہ بنانے کے لیے ہے اور یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کیونکہ میں نے جو کچھ قرآن اور سیرت مطہرہ سے سیکھا، تم لوگوں کے لیے قلم بند کر دیا۔ لیکن برِصغیر کے باشندوں کے لیے، صدیوں کی غلامی اور اپنی حقیقت سے ناآشنائی کے باعث، میری بات سمجھنی مشکل تھی۔ میں نے اسرارِ خودی کی تمہید میں کہا تھا کہ من نوائے شاعرِ فرداستم! (۱۲) اور اسی لیے میں نے اپنی شاعری میں زیادہ تر نوجوانوں کو مخاطب کیا ہے کیونکہ بڑی عمر کے لوگ تو، اپنی عادات میں، اس قدر راسخ ہو چکے ہوتے ہیں کہ ان میں تبدیلی کے امکانات بہت کم رہ جاتے ہیں۔

یاد رکھو! میرے کلام کی پرتیں اسی شخص پر کھل سکتی ہیں، جو قرآن سے آشنا ہو! جب تک کوئی قاری اپنے مسلک کی عینک اتار کر اور نرا مسلمان ہو کر میری شاعری نہیں پڑھے گا وہ میرے مدعا تک نہیں پہنچ سکتا۔ تم نے اکرم شاہ کو خط میں لکھا کہ اگر میں آسان زبان میں شاعری کرتا تو لوگوں تک میری بات آسانی سے پہنچ سکتی تھی۔ 'ہندی مسلمانوں کی بڑی بدبختی یہ ہے کہ ہمارے ہاں عربی زبان کا علم اٹھ گیا ہے اور قرآن کی تفسیر میں محاورۂ عرب سے بالکل کام نہیں لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں قناعت اور توکل کے وہ معنی لیے جاتے ہیں، جو عربی زبان میں ہرگز نہیں ہیں۔ ان لوگوں نے نہایت بے دردی سے قرآن اور اسلام میں ہندی اور یونانی تخیلات داخل کر دیے ہیں (۱۳)۔ لیکن اس کے باوجود میں نے جس دور میں شاعری کی اس عہد میں مسلمانوں کی کثیر تعداد عربی و فارسی سے آشنا تھی اور میری زندگی میں لوگوں نے دیر سے سہی لیکن میرے کلام کو سمجھا۔ مگر مملکتِ خداداد میں جس طرح قوم کو عربی اور فارسی سے دور کر کے قرآن

کریم اور ہماری روایات سے جدا کیا گیا ہے، یہ بات یقیناً قابل افسوس ہے۔

تم جانتے ہو! کئی نوجوان میرا فلسفۂ خودی پڑھنے سے صرف اس لیے گھبراتے ہیں کہ میری شاعری میں فقر پر بہت زور دیا گیا ہے اور یہ لوگ سوچتے ہیں کہ شاید" غریبی میں نام پیدا کر" کا مطلب، اسلامی تعلیمات اپنا کر، ساری زندگی غربت میں گزارنا ہے۔ یہ بات قابل افسوس ہے کہ ان لوگوں کو یہی بتایا گیا ہے کہ وہاں بہت غربت تھی، کئی کئی دن فاقے ہوتے تھے، کپڑوں میں پیوند تھے وغیرہ۔ لیکن انہیں یہ حدیث باور نہیں کرائی جاتی کہ آپؐ نے فرمایا کہ مجھے یہ بات گوارا نہیں کہ اللہ مجھے احد پہاڑ کے برابر سونا دے اور مجھ پر تین دن گزر جائیں اور میرے پاس اس میں سے ایک اشرفی بھی موجود ہو۔(۱۴) ان نوجوانوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ فقر سے میری مراد غربت و افلاس نہیں بلکہ وہی فقر ہے جس کے بارے میں آپؐ نے فرمایا تھا" الفقر فخری!" (فقر میرا فخر ہے)۔ یاد رکھو! فقر کا حقیقی مطلب" غیر اللہ کو ترک کرنا" ہے اور پاک ہستیوں کا فقر" اجباری" نہیں بلکہ" اختیاری" ہوتا ہے اور جو شخص امارت میں درویشی کر سکتا ہے، وہی روحانی قوت کا حقیقی سزاوار ہے۔

تم دیکھو گے کہ میرے پیغام سے لوگوں کو دور رکھنے میں دو گروہوں نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ ایک گروہ میرے حامیوں کا اور دوسرا میرے مخالفین کا ہے۔ میرے حامیوں میں تم جہادی، مارکسی، جمہوریت پسند، وطن پرست، تصوف پسند، تصوف مخالف اور دیگر مذہبی لوگوں کو دیکھو گے۔ یہ لوگ" خودی و بے خودی" کو سمجھے بغیر میرے اشعار سے اپنی مرضی کا مطلب نکالتے ہیں اور میرے اشعار سے محض شعلہ بیانی کا کام لیتے ہیں۔ دوسری جانب مخالفین نے بھی میرے خلاف محاذ کھول رکھے ہیں۔ کچھ لوگ میری ذاتی اور خاندانی زندگی سے ایسی ایسی چیزیں نکال کر توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں کہ افسوس ہوتا ہے! حد تو یہ ہے کہ میری ذات پر 'مے کش' اور 'طوائف کُش' ہونے کا جھوٹا الزام لگانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ آہ زیدی! میں نے خود تو کبھی ولی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا! لیکن یہ جھوٹے الزامات لگا کر اور میری ذاتی زندگی کو موضوعِ بحث بنا کر سادہ لوح لوگوں کو میری فکر اور فلسفہ سے گمراہ کرنا کہاں کا انصاف ہے؟ میں جانتا ہوں کہ یہ لوگ کبھی باز نہیں آئیں گے کیونکہ جو لوگ تحقیق سے عاری ہوں یا دین اسلام سے کدر رکھتے ہوں، وہ ہمیشہ میری ذات کو ہدفِ تنقید بناتے رہیں گے۔ کل اکرم شاہ مجھے اپنا ایک قطعہ سنا رہے تھے کہ

اقبالؔ ہے اسلام کی قدروں کا مدافع اس نکتہ روشن سے ہے، آگاہ زمانہ
جس شخص کو بھی دین سے، ہوتا ہے تعرض وہ شاعرِ مشرق کو بناتا ہے نشانہ(۱۵)

اکرم شاہ نے مجھ پر بیسیوں کتابیں لکھ کر اپنا نام نہیں بنایا بلکہ لوگوں تک میری فکر کو پہنچایا ہے۔ اکرم شاہ کا تعلق میرے قارئین کے اس گروہ سے ہے جو میرا کلام پڑھتے ہیں، سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور خلوص کے ساتھ اس کا پرچار کرتے ہیں اور جن لوگوں نے میرا کلام پڑھا اور سمجھا، یہ ان کا فرض بھی تھا کہ وہ اس پیغام کو عام کرنے کا باعث بنتے۔ مگر افسوس کہ زیادہ تر لوگوں نے میرے کندھوں پر کھڑے ہو کر اپنا قد اونچا کرنے کی سعی تو کی ہے لیکن میرے پیغام کو باور کرانے کی شعوری کوششیں کم ہوئی ہیں۔ میری شاعری پر کتابیں لکھنے والے بعض" اقبال شناسوں" نے تو میری فکر کو سہل کرنے کے بجائے مزید مشکل بنا دیا ہے۔ حالانکہ میرے بعد والوں کا کام تھا کہ وہ اس فلسفۂ خودی کو، جو برصغیر کے لوگوں کے لیے نامانوس تھا، سہل و آسان صورت میں پیش کرتے لیکن بعض اقبال شناسوں اور مذہبی قسم کے لوگوں نے تو میرے کلام کی ایسی ایسی تشریحات کی ہیں کہ میں خود حیران رہ جاتا ہوں کیونکہ ان کی تشریحات میری بیان کردہ چیزوں کے بالکل برعکس ہیں۔

میرے مخالفین میں تم بہت سے آزاد خیال لوگوں کو بھی دیکھو گے جو عظمتِ انسانی کے حوالہ سے میرے اشعار کو تو بہت پسند کرتے ہیں لیکن جب وہ میرے اسلامی فکر کے حوالے سے اشعار سنتے ہیں تو مجھ سے بُعد برتتے ہیں کہ میں نے اپنی شاعری کا محور و مرکز دینِ اسلام اور سرکارِ دو عالمؐ کی ذات کو بنایا ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ دین محض چند مذہبی رسومات کا نام ہے اور اخلاق آموزی کا ایک آلۂ کار ہے اور بس! باقی کاروبارِ زندگانی سے مذہب کا کوئی لینا دینا نہیں! سو وہ میری شاعری کی بھی دین سے ہٹ کر، فلسفہ کی رو سے تعبیرات چاہتے اور سیاست و مذہب کو الگ الگ رکھنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم مذہب پر، جذبۂ انسانیت کو ترجیح دیتے ہیں۔ آہ! چہ بے خبر ز مقامِ محمد ﷺ عربی است؟ آہ زیدی! جو لوگ انسانیت کے نام پہ ہر چیز کی آزادی چاہتے ہیں، وہ نہیں جانتے کہ ہر چیز کی آزادی، دراصل اپنی خواہشات کی غلامی ہے اور یہ خواہشات کی غلامی ہی بے راہ روی ہے تم جانتے ہو؟ یورپ میں جذبۂ انسانیت کی تحریک، بڑی حد تک ان قوتوں کا نتیجہ تھی جو اسلامی فکر سے بروئے کار آئیں۔ یہ کہنا مطلق مبالغہ نہیں ہے کہ جدید یورپین جذبۂ انسانیت کا جو ثمر، جدید سائنس اور فلسفہ کی شکل میں برآمد ہوا ہے، اسے کئی لحاظ سے محض اسلامی تمدن کی توسیع پذیری کہا جا سکتا ہے۔ اس اہم حقیقت کا احساس نہ آج کل کے یورپین کو ہے اور نہ مسلمانوں کو۔ کیونکہ مسلمان حکماء کے جو کارنامے محفوظ ہیں وہ ابھی تک یورپ، ایشیا اور افریقہ کے کتب خانوں میں منتشر اور غیر مطبوعہ شکل میں ہیں۔ آج کل کے مسلمانوں کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ جو کچھ ایک بڑی حد تک خود ان کے تمدن سے برآمد ہوا ہے، وہ اسے بالکل غیر اسلامی تصور کرتے ہیں۔ مثلاً

اگر کسی مسلم حکیم کو یہ معلوم ہو کہ آئن سٹائن کے نظریہ سے کسی قدر ملتے جلتے خیالات پر، اسلام کے سائنسی حلقوں میں سنجیدگی سے بحث ومباحثے ہوتے تھے، تو آئن سٹائن کا موجودہ نظریہ ان کو اتنا اجنبی معلوم نہ ہو (۱۷) تمہیں علم ہونا چاہیے کہ جس چیز کو دنیا اسلام کا زوال سمجھ رہی ہے، یہ اسلام کا زوال نہیں بلکہ مسلمانوں کا زوال ہے۔ اسلامی تعلیمات ہمیشہ سے آفاقی ہیں اور دنیا ان سے فیض حاصل کرتی چلی آرہی ہے اور کرتی رہے گی۔ یاد رکھو! اسلام دنیا سے جانے کے لیے نہیں بلکہ دنیا کو خیر عطا کرنے اور ہمیشہ رہنے کے لیے آیا ہے، لوکرہ الکافرون!

تم جانتے ہو؟ مجھے ان نوجوانوں پر بھی حیرت ہوتی ہے جو مجھے صرف اس لیے نہیں پڑھتے کہ انہوں نے 'کسی سے' سنا ہوا ہے کہ میرے خیالات نطشے سے مستعار ہیں۔ میں نے ڈاکٹر نکلسن کو بھی ایک خط میں لکھا تھا کہ 'بعض انگریز تنقید نگاروں نے اس سطحی مشابہت سے جو میرے اور نطشے کے خیالات میں پایا جاتا ہے، دھوکہ کھایا ہے اور غلط راہ پر پڑ گئے ہیں (۱۸)۔' میرا دعوی ہے کہ اسرارِ خودی کا فلسفہ مسلمان صوفیا اور حکما کے افکار ومشاہدات سے ماخوذ ہے اور تو اور وقت کے متعلق برگساں کا عقیدہ بھی ہمارے صوفیوں کے لیے نئی چیز نہیں۔ قرآن الٰہیات کی کتاب نہیں بلکہ اس میں انسان کی معاش ومعاد کے حوالہ سے جو کچھ کہا گیا ہے، پوری قطعیت سے کہا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جو کچھ قرآن میں ان چیزوں کے حوالہ سے کہا گیا ہے، اُن کا تعلق الٰہیات کے ہی مسائل سے ہے (۱۹)۔ جو لوگ میری فکر کو نطشے کا چربہ کہتے ہیں، وہ میرے جہاد سے متعلقہ اشعار سے بھی بہت خائف رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ "مار دھاڑ کا فلسفہ" نطشے سے چرایا گیا ہے۔ فلسفۂ جہاد کے بارے میں میرا موقف سمجھنے کے لیے اسرارِ خودی کا باب جس کا عنوان "در بیان اینکہ مقصدِ حیاتِ مسلم اعلای کلمۃ اللہ است و جہاد، اگر محرکِ او جوع الارض باشد، در مذہبِ اسلام حرام است" ضرور پڑھنا چاہیے تاکہ انہیں معلوم ہو کہ اسلام کا فلسفۂ جہاد کیا ہے!

واضح ہو کہ جو لوگ میری فکر کو محض میری اردو شاعری کے حوالہ سے جاننا چاہتے ہیں وہ زیادہ تر اس لیے بھی ناکام ہوتے ہیں کہ وہ بھول جاتے ہیں کہ اردو کے پہلے مجموعہ کلام بانگِ درا سے پہلے، میں اپنی شاعری کی تین کتابیں اسرارِ خودی 1915ء، رموزِ بے خودی 1918ء اور پیامِ مشرق 1923ء فارسی زبان میں شائع کر چکا تھا اور میں نے پہلی دو کتب میں تفصیل کے ساتھ اپنے نظریہ کو پیش کیا اور پھر ساری عمر اسی نظریے کو اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔ ہاں! میں اخباروں اور خاص کر انجمن حمایتِ اسلام کے جلسوں کے لیے خاص مقصد کے تحت اردو نظمیں لکھتا تھا اور گاہے مشاعروں میں بھی جاتا تھا۔ میں تو اپنا اردو کلام شائع بھی نہیں کروانا چاہتا تھا۔ یہ تو جب منشی قمر الدین نے میری اردو نظموں کو خود سے

چھاپ دیا(۲۰)اور میرے احباب نے مجھے مجبور کیا تو میں نے کافی اردو کلام حذف کرنے کے بعد بانگِ درا کی اشاعت کروائی اور وہ بھی زمانی ترتیب واضح کرتے ہوئے۔لیکن جن لوگوں نے میرا مطبوعہ کلام بھی مکمل نہیں پڑھا ہوتا، جو میں نے خود شائع کروایا ہے، وہ میری بازیافتیں نکال لاتے ہیں اور ان لوگوں کو موقع فراہم کرتے ہیں، جو میرے بعض ارتقائی افکار سے،عوام الناس کو گمراہ کرتے ہیں۔میری بازیافت کا یہ فائدہ تو ضرور ہے کہ کوئی میرے فکری و فنی ارتقاء کو سمجھ سکے اور اسی لیے بانگِ درا کو میں نے تین حصوں میں تقسیم بھی کیا۔لیکن میرے متروک اشعار کی بنیاد پر غلط نتائج اخذ کرنا یقیناً ظلم ہے۔ یاد رکھو! میری شاعری کے مدعا اور مقصد کو سمجھنے کے لیے میرے مقالات، اردو فارسی شاعری، خطوط اور خطبات سب کو پڑھنا ضروری ہے۔لیکن اکثر لوگ کسی ایک چیز کو پڑھ کر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ میری فکر کو سمجھنے اور اپنی زندگی کے مقصد کو پانے کے لیے اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی کو سمجھنا بہت ضروری ہے کیونکہ ملتِ اسلامیہ کا فلسفہ اس صورت میں اس سے پہلے کبھی مسلمانوں کے سامنے پیش نہیں کیا گیا۔(۲۱)

کیا تم دیکھتے ہو کہ ہمارے نوجوانوں کو آج کل ایک اور خطرناک چیز باور کروائی جارہی ہے کہ ہم برِصغیر کے لوگ ہیں اور ہمارے ہیرو یہاں کے مقامی باشندے ہیں؟ اسلام جو انسان کو زمان اور مکان کی قید سے آزاد کر کے آفاقیت عطا کرتا ہے، یہ سوچ ہمیں دوبارہ قیدِ مقام کے پھندے میں گرفتار کرنے کی ایک سعی ہے۔'اس زمانے میں اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن نسلی امتیاز اور ملکی قومیت کا خیال ہے۔میں نے قیامِ یورپ کے دوران اس بات کا پہلے پہل احساس کیا اور اس احساس نے میرے خیالات میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا۔حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی آب و ہوا نے مجھے مسلمان کر دیا۔اس دن سے جب یہ احساس مجھے ہوا، اپنی تحریروں میں یہ ہی خیال میرا مطمحِ نظر رہا ہے۔ معلوم نہیں میری تحریروں نے اور لوگوں پر اثر کیا یا نہیں کیا لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اس خیال نے میری زندگی پر حیرت انگیز اثر کیا(۲۲)۔میرے پیغام کو کوئی محدود کرے تو یہ زیادتی ہے کیونکہ میرا پیغام ایک آفاقی پیغام ہے اور اس کی بنیاد محبت ہے۔میرا پیغام صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ تمام عالم انسانیت کے لیے ہے اور درحقیقت یہ اسلام ہی کا آفاقی پیغام ہے۔اسی لیے میں نے کہا تھا کہ'اسرارِ خودی کی صورت میں جو بیج، مردہ زمین میں، اقبالؔ نے بویا ہے، اُگے گا، ضرور اُگے گا اور علی الرغم مخالفت بارآور ہوگا۔مجھ سے اس کی زندگی کا وعدہ کیا گیا ہے۔(۲۳)

میں جانتا ہوں کہ جب سے تم نے درسِ اقبالیات کا آغاز کیا ہے تو رفیقوں نے تم سے رقیبوں کا سا سلوک شروع کر دیا ہے۔وہ نہیں جانتے کہ حلاج کی سولی، منبر کی رقیب نہیں ہوتی اور نہ ہی خس و خاشاک، شعلے کا کچھ بگاڑ سکتے

ہیں۔ تم اپنا کام کیے جاؤ اور اس کا اجر اللہ پر چھوڑ دو! تم جانتے ہو ؎ تا کشد خار از کفِ پا، رہ سپر،،، می شود پوشیدہ محمل، از نظر،،، درسِ اقبالیات میں شرکت کرنے والوں کو میرا سلام کہنا اور انہیں یہ بھی بتانا کہ میرا کلام اس لیے نہیں ہے کہ تم لوگ اس کو پڑھ کر یہ سمجھو کہ تم نے زندگی کی حقیقت پالی بلکہ اس پر عمل بھی کرو کیونکہ اسلام محض کسی فلسفہ کا نام نہیں بلکہ ایک عملی مذہب ہے اور اس کا مقصود تسخیرِ کائنات ہے!

مرزا تمہیں سلام کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ذرہ اگر سورج نہیں بن سکتا تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ خورشید بننے کی تمنا اور کوشش چھوڑ دے!

والسلام! محمدؐ اقبال

مآخذ

۱۔ کلیات مکاتیب اقبال، مرتبہ مظفر حسین برنی، ج 1، لاہور، س ن، ص 367
۲۔ ایضاً، ص 378
۳۔ ایضاً، ص 380
۴۔ ایضاً، ص 510
۵۔ ایضاً، صص 362-363
۶۔ ایضاً، ص 344
۷۔ ایضاً، ج 2، صص 54-55
۸۔ ایضاً، ج 1، ص 382
۹۔ ایضاً، ج 1، ص 420
۱۰۔ ایضاً، ج 1، ص 371
۱۱۔ ایضاً، ج 1، ص 318
۱۲۔ اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (فارسی)، لاہور، 1981ء، ص 6 (میں آنے والے کل کے شاعر کی آواز ہوں)
۱۳۔ کلیات مکاتیب اقبال، مرتبہ مظفر حسین برنی،، ج 1، لاہور، س ن، ص 385
۱۴۔ صحیح بخاری، حدیث نمبر 6268
۱۵۔ اکرام، ڈاکٹر سید محمد اکرم، آئینہ آفاق، لاہور، 2011ء، ص 115
۱۶۔ اقبال، علامہ محمد، ضرب کلیم و ارمغانِ حجاز (اردو)، لاہور، 1998ء، ص 188
۱۷۔ کلیات مکاتیب اقبال، مرتبہ مظفر حسین برنی،، ج 2، لاہور، س ن، صص 436-437
۱۸۔ ایضاً، ج 2، ص 159
۱۹۔ ایضاً، ج 2، صص 168-169
۲۰۔ ایضاً، ج 1، ص 419
۲۱۔ بہ حوالہ ایضاً، ج 1، ص 443
۲۲۔ ایضاً، ج 2، ص 195
۲۳۔ ایضاً، ج 1، ص 369
۲۴۔ اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال (فارسی)، لاہور، 1981ء، ص 138
ترجمہ: جب تک مسافر اپنے پاؤں سے کانٹا نکالتا ہے تو محمل اس کی نظروں سے پوشیدہ ہو جاتا ہے۔
۲۵۔ غالب، مرزا اسد اللہ خان، کلیاتِ غالب، لاہور، 1965ء، ص 276
مرزا کا مشہور فارسی شعر یوں ہے: گفتمش: "ذرہ بہ خورشید رسد؟" گفت: "محال"
گفتمش: "کوششِ من در طلبش؟" گفت: "رواست"

علامہ اقبال کا جوانوں کے نام پیغام و دعا

*ڈاکٹر طیب نواز **ڈاکٹر تحسین بی بی

Allama Iqbal's message and prayer to the youth

Dr. Tayyab Nawaz/ Dr Tehseen Bibi

The purpose of this article is the elaboration of the message which Iqbal wished to see the youth furnished with. He teaches the lesson of Ego to the youth. His poetry, obviously, conceptualizes a youth of great characters and dispositions.

Iqbal's Poetry is generally, for the whole Muslim world but for the Indians Muslims at has the divine power of resurrection infect the trampet of Asrafil. His poetry inspires the youths and awakens their dashing sprit. Through his poetry Iqbal creates the feeling conscience of Abraham in the breasts of the Muslim youths. The youths are of special significant worth for Iqbal. He entitles the youth eagle(shaheen(Because his eagle has all the attributives of a man of Muslim manhood(Mardi Momin(which ought to be in Mardimomen. He encourages the Muslim youth to make the impossible inevitable.He warns the Muslim youths again the Blits of western civilization. He instructs the Muslim youth to get away from it. He rather exhorts the youth to work hard. He apprehends, the inertia of unruffled life something even worse then death

* اسلامیہ کالج، پشاور ** ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو قرطبہ یونیورسٹی آف سائنس اینڈ انفارمیشن ٹیکنالوجی، پشاور

علامہ اقبالؒ ہماری ادبی، ثقافتی، قومی وملی تاریخ کا بڑا معتبر حوالہ ہے۔ علامہ اقبال کی حیثیت ایک دیدہ ور کی سی تھی جو نرگس کی ہزار سالہ خون آشامی کے بعد ہماری قوم کے چمن کی آبیاری کے لیے پیدا ہوا تھا۔ وہ ایک ایسے زمانے میں پیدا ہوئے جب مشرق ومغرب میں زندگی کے ہر شعبے میں عجیب وغریب انقلاب رونما ہو رہے تھے۔ اس دور میں مشرق پر مغربی ذہن وفکر کی فتوحات کا سکہ بھی بیٹھ چکا تھا۔ ان حالات میں اقبالؔ کی شاعری گرداب میں پھنسی ہوئی کشتی اسلام کی ناخدا بن گئی۔ جس نے نہ صرف مسلمانوں کو طلاطم خیز موجوں سے ٹکرانے کا درس دیا بلکہ طوفان حوادث کا رُخ موڑ نے کا راز بھی بتا دیا۔

اقبال جیسے شاعر کی دور اندیش نگاہوں نے اُس وقت کے حالات کو بھانپ لیا۔ اقبال کو یقین تھا کہ نوجوانان اسلام ہی ان کے آرزوؤں کے چراغ اور اُمید کے آفتاب ومہتاب ہیں۔ ان کی روشنی آج مدہم سہی کل تیز ہوگی اور مستقبل کی شاہراہ اس روشنی سے جگمگا اُٹھے گی۔

"نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے ذرا تم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی"(۱)

علامہ اقبال کا پیغام دراصل نئی نسل سے اُن کی امیدوں کی عکاسی کرتا ہے۔ اُن کے خیال میں انقلاب سے محروم زندگی موت کا پیغام ہوتی ہے۔

"جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی روح امم کی حیات کشمکش انقلاب"(۲)

اقبالؔ کے خیال میں زندگی جامد وساکت نہیں، نامیاتی وحرکی ہے۔ اس کی تسخیر کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔

"زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ جوئے شیر وتیشہ وسنگ گراں ہے زندگی"(۳)

اپنے فلسفہ حیات میں بنیادی حیثیت اقبالؒ نے قوت عمل ہی کو دی ہے۔ سید وقار عظیم کہتے ہیں:

"اقبال کا پیغام اپنے قاری کے لیے آزادی فکر، بے باکی اندیشہ اور مستی کردار کا پیغام ہے۔ انسان جو نائب الٰہی ہے اور جسے تسخیر کا افسوں پھونک کر فطرت کی قوتوں کو اپنے مقاصد کا تابع بنانا ہے، اسی طرح محبوب فطرت بنتا ہے کہ وہ "راہ عمل پر گامزن" ہو اور مشکل کشی، جفاطلبی کو اپنی سرشت بنائے۔"(۴)

اقبال جوانوں کو یقین محکم کا پیغام دیتا ہے۔ اقبال اس یقین کو کئی ناموں سے پکارتے ہیں۔ کبھی جنون وعشق، کبھی دردوسوز، طلب وجستجو، ذوق وشوق اور قلب ونظر، کہہ کر ہمیں اس کے اپنانے کی تاکید کرتے ہیں۔ یہ ہی صفات ہیں

جوانسان کو صفات الٰہیہ سے ہمکنار کر کے کلیم الہیٰ کے منصب پر فائز کرتے ہیں۔ وہ نوجوانوں میں ایسی صفات کے خواہشمند ہیں جن کو بروئے کار لا کر وہ کائنات میں انقلاب برپا کر دیں۔

"نعرہ زد عشق کہ خونین جگری پیدا شد　　حسن لرزید کہ صاحب نظری پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاک جہان مجبور　　خود گری، خود شکنی، خود نگری پیدا شد"(۵)

جوانوں کے دل زندہ اور روحیں عقابی ہوتی ہیں جن میں جھپٹنے، پلٹنے، پلٹ کر جھپٹنے کا سلیقہ ہوتا ہے اور اُن کی ہمت مردانہ ستاروں پر کمندیں ڈال سکتی ہے۔ اُن کے حوصلے نخچیری یزدان شکار اور اور غیور و جرار ہیں۔ اُن کی طبیعتیں خطر پسند اور ارادے بلند ہوتے ہیں۔ وہ فقر شبیری کو اپنا توشہ اور پہاڑوں کی چٹانوں کو اپنا سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے اندر خود گری، خود شکنی، اور خود نگری کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان ہی خصوصیات کی بنا پر اقبالؒ نے اپنے پیغام میں نوجوانوں ہی کو مخاطب کیا ہے۔ ان کے لئے خدا سے دعائیں مانگی ہیں۔ اقبال نے ان کو حوصلہ دیا ہے جوان کے فلسفے میں آگے چل رک کہیں خودی سے، کہیں سوز جگر سے اور کہیں عشق و نظر کے نام سے پکارا گیا ہے اور کہیں نوجوانوں کے سرمایہ حیات سے تعبیر کیا گیا ہے۔

"جوانوں کو سوز جگر بخش دے　　میرا عشق، میری نظر بخش دے"(۶)

وہ نوجوان طالب علم کی بے خروش اور بے جان زندگی اور علم کو روح کے بجائے جسم پروری کا وسیلہ بنانے پر بڑی دردمندی سے گویا ہیں کہ:

"خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے　　کہ تیری بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو　　کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں"(۷)

اقبال نے نوجوانوں کو شاہین کے نام سے کبھی پکارا ہے اس لیے کہ ایک نوجوان میں وہ جس قسم کے مردانہ اوصاف دیکھنے کے آرزومند ہیں۔ وہ نوجوانوں کے لیے دست بدعا ہیں یہ دعا اس کی دل سے نکلی ہوئی آہ ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں۔

"نوجوانوں کے لیے ایسی دردمندانہ دعا شاید ہی کسی اور شاعر کے دل سے کبھی نکلی ہو۔"(۸)

چنانچہ اقبال نے جگہ جگہ شاہین اور اس کی صفات کا ذکر کر کے نوجوانوں کی سیرت و کردار میں ان خصوصیات کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔

"جوانوں کو میری آہ سحر دے پھر ان شاہین بچوں کو بال وپر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے مرا نور بصیرت عام کردے"(۹)
"عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں"(۱۰)
"افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات"(۱۱)

اقبال کی شاعری ایک نئی آواز ہے اُن کے جوانوں کے نام اشعار میں اُن کا لب ولہجہ اور انداز بیان یکسر نرالا ہے۔اُن کے خیال میں شاعری محض جذبات واحساس کا نام نہیں بلکہ اس سے قوموں کی اصلاح اور بیداری کا کام بھی لیا جاسکتا ہے۔اُن کا پیغام جوانوں کو ایک دعوت فکر وعمل دئے رہا ہے۔وہ جوانوں میں اعلیٰ صفت مسلمانوں کی خوبیاں دیکھنا چاہتے تھے تاکہ وہ نیابت الہیٰ کا فریضہ سرانجام دے سکیں۔وہ جوانوں کو عشق کا درس دیتے ہیں جو انسان میں عمل کی صلاحیت کو بیدار کرتی ہے۔نوجوانوں کو وہ مشکلات حیات میں بے خوفی کے ساتھ آگے بڑھنے کے طریقے سکھاتے ہیں۔ان کو یقین کی تاکید فرمائی ہے۔ان کے خیال میں یقین ایمان ہی ہے۔وہ انسان کو اپنے مقام ومرتبے کی پہچاننے کا درس دیتے ہیں۔عبدالرحمٰن طارق لکھتے ہیں:

"علامہ اقبال یہ دعویٰ باندھنے میں بھی سوفیصدی حق بجانب ہیں کہ جب تک آپ" انسان" کا صحیح مقام ومرتبہ نہ سمجھیں، اواس کی ممکنات پر یقین محکم نہ رکھیں۔آپ نہ تو خدا کی ذات وصفات کو پہچان سکتے ہیں اور نہ اس تک آپ کی رسائی ممکن ہے۔بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ کی کا عرفان اور اس پر ایمان کامل اسی وقت ممکن ہے کہ پہلے آپ آدمی کا مقام سمجھیں اور خود کو پہچانیں۔"(۱۲)

اقبال جوانوں کو الوہی صفات سے متصف ہونے کا درس دیتے ہیں جس سے وہ خدا کا ہاتھ بن جاتا ہے اور قرآن کی تعلیمات پر عمل کرکے نیابت کی ذمہ داریاں انجام دیتا ہے۔

"خاکی ونوری نہاد، بندۂ مولا صفات ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز"(۱۳)

اقبال کے نوجوان میں یہ خوبی سب سے ممتاز ہے کہ وہ جغرافیائی حدود کا پابند نہیں ہوتا۔اقبال کے جوان کا ایمان بلالؓ جیسا ہوتا ہے۔جس کی خودی اور عشق ہر ضرب پر احد۔احد پکارتی ہے۔ان کا جوان ہر طرح اپنے لیے نیا

جہاں پیدا کرلیتا ہے۔ وہ ہر روز ایک نئی شان کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ ہر قدم پر اس کا ایک نیا افق پیدا ہوتا ہے۔ وہ جوانوں کو خودی اور خود شناسی سبق دیتے ہوئے کہتے ہیں :

"ہر شاخ سے یہ نکتہ پیچیدہ ہے پیدا پودوں کو بھی احساس ہے پہسنا کے قضا کا!
ظلمت کدہ خاک پہ شاکر نہیں رہتا ہر لحظہ ہے دانے کو جنوں نشوونما کا!
جرات ہو نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے اے مرد خدا ملک خدا تنگ نہیں ہے"(۱۴)

اُن کا جوان مجدد الف ثانیؒ ہیں جنہوں نے اکبر کے جاہ وجلال سے متاثر ہوئے بغیر اپنی حق گوئی اور بہادری کا اظہار کیا تھا۔ اقبال جوانوں کو رحمانیت اور ربوبیت کا درس دیتے ہیں۔ جنہیں تلاش کر کے انسانیت اپنی معراج پر جا پہنچتی ہے۔

"قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان"(۱۵)

اقبالؔ کے جوان میں ہر دم اور ہر لحظہ تقدیر شکن قوت باقی رہتی ہے۔ وہ جوانوں کو باطل کے سامنے نہ جھکنے کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ جوانوں میں خودداری اور ہمت وحوصلے کا جنون پیدا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:

"نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری"(۱۶)

وہ جوانوں کو مرد میدان بناتے ہیں گوشہ نشین نہیں اُن کو ایام کا راکب کہتے ہیں مرکب نہیں یہ دنیا اُس کے لیے ہے وہ دنیا کے لیے نہیں۔

ارباب دانش اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہے کہ تشکیل سیرت وکردار اور حسن عمل کے مظاہرے کے لیے تربیت بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔

"مذہب کی حرارت بھی ہے کچھ اس کی رگوں میں تھی جس کی فلک سوز کبھی گرمئ آواز
پانی نہ ملا زمزم ملت سے جو اس کو پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز"(۱۷)

نوجوان نسل کی تربیت میں اسلامی اصولوں کو پیش نظر رکھ کر ہر مشکل کو آسان اور ناممکن بنایا جاسکتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہوتا ہے کہ نوجوان خطرات سے بچنے کی بجائے ان کا تعاقب کرتا ہے بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ موت کے کمر میں ہاتھ ڈال کر گھبرانے کی بجائے رقص کرتا ہے۔ اگر جوانوں کی تربیت نہ کی گئی تو پھر معاملہ الٹ ہوگا۔ اور اقبال گویا ہوتا ہے۔

"وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو ہو جس کے رگ وپے میں فقط مستی کردار"(۱۸)

اقبالؔ یقیناً جوانوں سے امیدیں وابستہ کیے ہوئے ہیں۔آپ نے ہر جگہ جوانوں کو ہی مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیال فقر وغنا نہ کر کہ جہاں میں نان شعیر پر ہے مدار قوت حیدریؓ"(۱۹)

اقبالؔ جوانوں کو قبیلے کی آنکھ کا تارا کہتے ہیں:

"وہی جوان ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا شباب جس کا ہے بے داغ،ضرب ہے کاری"(۲۰)

علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؔ نوجوانان ملت کو کارزار ہستی میں سیرت فولاد اپنانے کی تلقین کرتے ہیں تاکہ وہ زندگی کے معرکے میں فتح یاب ہوسکیں۔اُن کو محبت،شفقت،انس،یگانگت،یکجہتی کا درس دیتے ہیں۔ٹھہراؤ،بے عملی اور سکون وقرار زوال کے اسباب ہیں۔اس لیے ان سے دور رہنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

"مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر شبستان محبت میں حریر و پرنیاں ہوجا"(۲۱)

"ساحل افتادہ گفت، گرچہ بسی زیستم هیچ نه معلوم شد آه که من چیستم
موج ز خود رفته تیز خرا مید وگفت هستم اگر میروم گرنه روم نیستم"!(۲۲)

آپؒ کے نزدیک جوان ہی محور ومرکز کائنات ہے۔اقبالؒ انقلاب پسند شاعر ہیں وہ اپنی قوم کے نوجوان کو ہر آن محو پرواز دیکھنا چاہتے ہیں۔نوجوان کسی آن بھی کوشش،جستجو،عمل سے عاری،سوز و درد سے بیگانہ نہ ہو۔وقت کے یزیدوں کا مقابلہ مثل حسینؓ کرے۔شخصیت اور خودی کو مجروح نہ ہونے دے۔بھروسہ اور اعتماد رکھیں۔شہرت دوام کے آسمان پر چاند تاروں کی طرح درخشاں نظر آئیں۔اقبال چاق وچست اور تر دماغ جوان ہی قوم کا سرمایہ خیال کرتے ہیں۔وہ انہیں آہ سحر کی سحر کاری سے آگاہ کرتے ہیں۔کہتے ہیں کہ اے جوانان وطن اپنے آپ کو زور حیدرؓ،فقر بوذرؓ اور صدق سلمانی سے مزین کیجئے۔قرون اولیٰ کے عہدِ سعادت کو لوٹا دیں تاکہ دنیا میں امن آجائے اور ہر چھوٹے بڑے کا دامن برکات ارضی وسماوی سے مالامال ہوجائے۔

"اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے مشرق ومغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے"(۲۳)

وہ اپنی کتاب" جاوید نامہ" میں بھی نہایت خلوص قلب سے اپنے جوان بیٹے جاوید اقبالؔ کو نصیحت کرتے ہیں۔انہیں اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کے اصول سکھاتے ہیں اُن میں جوش وولولہ پیدا کرکے اُن کا خون گرم کرتا ہے۔اقبال نے جوانوں کو حُسن عمل،کوشش پیہم،شجاعت،عشق ومحبت،اجتماعی مفاد،ہمدردی،اور احترام

انسانیت سکھایا۔نئی پود کو عقیدہ توحید پختہ طور پر اپنانے کی تاکید کی۔صرف زبانی اقرار کلمہ کی کافی نہیں سمجھی بلکہ زبان اقرار کے ساتھ باطل، شر پسند اور شیطانی قوت سے نبرد آزما ہونے کا عمل درس دیا۔

"اے لاالہٰ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں گفتار دلبرانہ، کردار قاھرانہ"(۲۴)

جوانوں کو افرنگی غلبہ واقتدار سے نجات حاصل کرنے کا درس دیا۔انگریز اور دیگر اقوام کی پیروی کرنے پر بڑے افسوس کا اظہار کیا اور زندگی میں میانہ روی، احکام الٰہیٰ کی پابندی اور عدل وانصاف کے قیام کا درس دیا۔

"ترے صوفے ہیں افرنگی، ترے قالین ایرانی لہو مجھ کو رُلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی"(۲۵)

حصول علم اور معرفت ذات کے لئے نئی نسل کو کم کھانے کم سونے اور بولنے کی ترغیب دی اور ان ہی چیزوں سے زندگی میں اعلیٰ مقاصد کا حصول ممکن ہے۔اقبال کہتے ہیں۔

"کم خوروکم خواب وکم گفتار باش گردخود گردندہ چوں پر کار باش"(۲۶)

"اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور وغیور قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں"(۲۷)

اقبال جوانوں کو فولاد جیسی مضبوط اور ناقابل شکست شخصیت کی تعمیر وتشکیل کی تلقین کرتے ہیں۔

"اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی ہو جس کے جوانوں کی خودی صورت فولاد"(۲۸)

وہ قبیلے کا پیارا اور عزیز جوان وہی قرار دیتے ہیں جس کا شباب بے داغ ہو، زندگی گناہ ولعب سے پاک وصاف ہو اور میدان کارزار میں کاری ضرب لگاتا ہو، فرض شناس ہو اور حوصلہ شکن خطرات پر خوش اُسلوبی اور حسن تدبیر سے ہی قابو پاتا ہو۔کہ خدا نے تیری تقدیر پہلے سے ہی لکھ رکھی ہے اب نہیں ہے۔خدا نے تمھاری جبین خالی رکھی ہوتی ہے۔جس کو تو نے اپنے حسن عمل لکھنا ہے۔مسلسل محنت سے تیری قسمت اچھی بن جائے گی۔اگر تو نے عیش کوشی سے کام لیا تو تیری قسمت خود بخود بگڑ جائے گی۔

"تو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں"(۲۹)

"ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے؟ خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟
عبث ہے شکوہ تقدیر یزداں تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے؟"(۳۰)

"یہ گھڑی محشر کی ہے، تو عرصہ محشر میں ہے! پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے!"(۳۱)

اقبال کے افکار نے قوم کے تمام افراد کو متاثر کیا ہے۔نوجوانوں کو انھوں نے اپنی شاعری کا مرکز ومحور بنایا۔

اُن کے لیے دعا گو رہے اور ایک ماہر ڈاکٹر کی طرح نسخہ بھی تجویز کیا ہے۔ اپنی تصانیف میں کبھی اُن کو شاہین کیا ہے کبھی خطاب بہ جوانان اسلام، اور کبھی منتشر زرین اشعار میں اُن کو اخلاق عالیہ کے اختیار کرنے کا درس دیا ہے۔ نوجوانوں کے دلوں کو حرارت بخشی ہے اور ان کو شاندار ماضی یاد دلایا ہے۔

"کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے؟ وہ کیا گردوں تھا، تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا؟"
"گنوا دی ہم نے جو اسلاف کے میراث پائی تھی ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا" (۳۲)

اقبال نوجوانوں سے عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے ستاروں پر جو ڈالتے ہیں کمند!" (۳۳)

اقبال کے خیال میں جوان عمل، مذہبی اور اخلاقی طور پر بے جان لاشہ نہیں بلکہ کبھی طارق بن زیاد بن کر رحمت کے بادل برساتا ہے اور کبھی یہی نوجوان عقبہ بن نافع بن کر بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑاتا نظر آتا ہے۔

اقبال جوانوں میں "شاہین" جیسی روح بیدار کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان میں اپنی منزل بلند سے بلند تر دیکھنے کی تڑپ پیدا ہو۔ پروقار زندگی اور اعلیٰ مدارج کے حصول کے لیئے شاہین صفت ہونا وقت کا اہم تقاضا ہے مگر اس کے لیے:

"چیتے کا جگر چاہیے شاہیں کا تجسس جی سکتے ہیں بے روشنی دانش وفرہنگ" (۳۴)

الغرض اگر آج بھی ہم اقبال کی تعلیمات پر ہم عمل کریں تو جہاں گیر، جہاں دار، جہانباں اور جہان آراء بن سکتے ہیں مگر اس کے لیے شرار آرزو، مسلسل عمل صالح اور بے تکان ہمت کی ضرورت ہے۔ زندگی کی مشکلات کا حوصلہ مندی اور مردانہ وار سے مقابلہ کی دعوت دی ہے۔

اقبالؒ کی "بانگ درا" نے غفلت کی نیند سوئی ہوئی ملت کو بیدار کیا۔ اس کی "بال جبریل" نے درماندہ قوم کو شوق پرواز بخشا۔ اس کی "ضرب کلیم" نے جبر واستبداد کے ہر پیکر کو ریزہ ریزہ کرنے کا درس دیا۔

آج ہمیں اقبال کی فکر کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ خدا کرے کہ ہمارے جوان ان کو سمجھے اور عمل کے ذریعے دین و دنیا کو اچھا بنائے۔

حوالہ جات

۱۔ علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال (اردو)، شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیوٹ) لمیٹڈ پبلشرز، لاہور، طبع سوم 1996ء، ص 11/303

۲۔ ایضاً، ص 100/392 ۳۔ ایضاً، ص 259/259

۴۔ سید وقار عظیم، اقبال شاعر اور فلسفی، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، 1997ء، ص 111

۵۔ علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال (فارسی) شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیوٹ) لمیٹڈ پبلشرز، لاہور، شاعت دوم (1975)، ص 85/255 ۶۔ علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال (اردو)، ص 124/416

۷۔ ایضاً، ص 82/544

۸۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اقبال سب کے لیے، الوقار پبلی کیشنز لاہور، (1996)، ص 511

۹۔ علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال (اردو)، ص 86/378

۱۰۔ ایضاً، ص 120/412 ۱۱۔ ایضاً، ص 157/449

۱۲۔ عبدالرحمٰن، طارق، جوہر اقبال، شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز لاہور، س۔ن، ص 243

۱۳۔ علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال (اردو)، ص 97/389 ۱۴۔ ایضاً، ص 52، 53/514، 515

۱۵۔ ایضاً، ص 60/522 ۱۶۔ ایضاً، ص 38/680

۱۷۔ ایضاً، ص 245/245 ۱۸۔ ایضاً، ص 40/502

۱۹۔ ایضاً، ص 252 ۲۰۔ ایضاً، ص 171/633

۲۱۔ ایضاً، ص 273/273 ۲۲۔ علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال (فارسی)، ص 128/298

۲۳۔ علامہ محمد اقبا، کلیات اقبال (اردو)، ص 263/263

۲۴۔ ایضاً، ص 54/346 ۲۵۔ ایضاً، ص 119/411

۲۶۔ علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال (فارسی)، ص 203/791

۲۷۔ علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال (اردو)، ص 20/482

۲۸۔ ایضاً، ص 72/534 ۲۹۔ ایضاً، ص 176/638

۳۰۔ ایضاً، ص 32/674 ۳۱۔ علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال (اردو)، ص 260/260

۳۲۔ ایضاً، ص 180/180 ۳۳۔ ایضاً، ص 154/446

۳۴۔ ایضاً، ص 76/368

***

"شکوہ" "جواب شکوہ" اور اسلامی نو آبادیات

* ڈاکٹر رضوانہ نقوی

Shikwa, Jawab_a Shikwa and Islamic colonialism

Dr. Rizwana Naqvi

Colonialism is a practice of power on vanquished lands&people. It refers to the combination of territorial, juridical, cultural,linguistic, political, mental and economic domination of one country, group or people by another. Subcontinent India was a part of British colonial system from 1858 to 1947 during this period Indian people proved the good slaves of British Raj a word"Native"was their identity which reflects the poverty, inability, impuissance, unemployment, famine, poor sanitary& health conditions, lack of access to sapience, education and healthcare, cast based oppressions, religious violence&constant tolerance.In this age of discrimination many leaders try to set the fire in the heart&souls of Indian people Iqbal was one of them, his poetry is a message of freedom&selfrespect.'Shikwa, Jawab_a Shikwa' are directly refers to Muslim community in most soulful&alive way of narration, where not only the Indian Muslims but the all Muslim Community&world is under discussion in a wider prospect.The European powers colonized one Islamic country after another France occupied Algeria in 1830, and Britain Aden nine years later. Tunisia was occupied in 1881, Egypt in 1882, the Sudan in 1889 , Libia&Moroco were dominated in 1912 , at this decadence of Ummah Iqbal complaints to God.This wail unrevealed the facts& impacts of history, time&Muslim's bearings towards their future.

اقبال کی نظم "شکوہ" (۱) ہندوستان میں برطانوی نو آبادیاتی (۲) عہد کی تخلیق ہے۔ یہ نظم جراءت اِظہار، ساخت

* پروفیسر شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج برائے خواتین، جہلم

وتشکیل اور فی حوالوں سے ایک نمایاں تخلیق ہونے کے ساتھ ہندوستان ہی نہیں بلکہ پوری امت مسلمہ (کہ جسے اقبال نے "امت مرحوم" کے لقب سے یاد کیا ہے) کے سماجی، مذہبی، معاشی، معاشرتی اور روحانی زوال کو نشان زد کرتی ہے۔ بیسویں صدی کی پہلی دہائی کہ جب اقوام عالم نو آبادیاتی فریب کاریوں اور مغربی استعماریت کے شکنجے سے نکلنے کے لئے ہاتھ پیر مار رہی تھیں ایسے میں "امت مرحوم" کی یہ فریاد نہ صرف دلدوز بلکہ معنی خیز بھی ہے کہ جو اقوام اسلام کے اس زوال اور مخفی غلامی کو نشان زد کرتی ہے کہ جو اس وقت سے عہد حاضر تک ملک عزیز اور دیگر اسلامی ممالک میں مغربی پنجۂ استبداد اور اس استبداد کو تقویت دینے والی مقامیت کی صورت میں موجود ہے۔ بظاہر شکوے کا یہ انداز مسلمان حکمرانوں کے ضمیر کو آئینہ دکھانے اور ان کی حمیت کو جھنجھوڑنے سے بھی عبارت ہے کہ شاید اب وہ خواب غفلت سے سنبھل پائیں مگر 1911ء سے آج تک صورتحال میں تبدیلی ممکن نہیں ہوسکی۔ سترھویں سے اٹھارویں صدی تک یورپی اقوام اپنی طاقت وحکمت عملی کے مظاہر کرۂ ارض کی ٪30 زمین پر قبضے کی صورت میں دکھا چکی تھیں 1878ء تک انسانی آبادی کا ٪ 67 حصہ یورپی اقوام کے زیر نگیں تھا۔ اور 1914ء تک 204000 مربع میل کے رقبے پر اقوام مغرب فاتح ومختار کی صورت موجود تھیں جو کرۂ ارض کی کل زمین کا ٪ 85 حصہ بنتا ہے (3)۔ یوں دنیا کا ایک بڑا حصہ مغربی نو آبادیات میں ڈھل کر اک ایسے انسانی المیے سے دو چار ہوا جس کے اثرات نو آبادیاتی عہد کے گزر جانے کے بعد بھی ابھی تک موجود اور مسلم ممالک میں بدلی ہوئی شکلوں میں آج تک جاری وساری ہیں۔ 1970ء کے قریب تقریباً تمام نو آبادیاتی ممالک یورپی استعماریت سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے مگر دوسری جنگ عظیم کے بعد اِک نئی نو آبادیات کی شکل کرۂ اراض پہ ابھری کہ جہاں متعدد ممالک وقوتوں کی بجائے دو نمائندہ قوتیں "امریکہ" اور "سوویت یونین" کی صورت زمینی نقشے پر ابھریں اور سیاسی، عسکری اور سفارتی مداخلت کے ذریعے اِک نئے نو آبادیاتی منظر نامے کو متشکل کیا کہ جہاں ان کے زیر اثر وتابع ممالک بظاہر آزاد مگر اپنے فیصلوں میں ان دو طاقتوں کے غلام تھے اور سوویت یونین کے خاتمے کے بعد واحد عالمی طاقت کے طور پر "امریکہ" دنیائے عالم بالخصوص اسلامی ممالک کی آزادی اور قوتِ فیصلہ کو جس انداز سے اپنے بس میں کیے ہوئے ہے اسکا حالیہ منظر نامہ اسرائیل اور فلسطین کی خون ریز جھڑپوں میں مسلم ممالک کی غیر فعالیت کی صورت بہت واضح ہے۔ مسلم ممالک بظاہر آزاد مگر قوت فیصلہ اور عمل ورد عمل کے تمام تر سلسلوں میں برطانیہ کے بعد نئے استعماری آقا "امریکہ" کے غلام ہیں۔ عراق، افغانستان کے منظر نامے اسی درد وکرب وابتری سے عبارت ہیں کہ جو تقریباً ایک صدی قبل "شکوہ" اور

اس کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد" جواب شکوہ" کے دور میں اقبال کے ارد گرد عالمی و مقامی سطح پر موجود تھا۔ فرق فقط یہ تھا کہ اس وقت ہندوستان کے حکمران بھی غیر ملکی تھے جبکہ آج ان ممالک میں حکمران اور نئے اصلاح شدہ انتظامی ادارے تو وجود پذیر ہو گئے ہیں مگر اختیار و فیصلے کی قوت آج بھی عالمی طاقتوں کے ہاتھ میں ہے اور انگریزی، یورپی، ہسپانوی کا غلبہ روایتی نو آبادیات ہی کی ایک نئی صورت ہے۔ یورپی طرز حیات، خوراک، لباس، طرز تعمیر، فنون و نظریات کو اسی غیر تنقیدی نظر سے قبولنے کا رویہ عام ہے جو عہد نو آبادیات کا خاصہ تھا" یہ تصور بھی عام ہے کہ مقامی حکمران مقامی آبادی کے نمائندہ ہونے کا ڈھونگ رچانے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں اور یہی چیز انہیں مقامی طور پر قابل قبول بناتی ہے اور نئے استعمار کی آشیر باد سے سرفراز کرتی ہے۔ اسکے علاوہ قومی تشخص اور ثقافتی وجود کو جو کاری زخم عہد نو آبادیات نے لگائے ہیں ان سے ابھی بھی خون رس رہا ہے" (4)۔ یہاں تک کہ اب یوں لگتا ہے کہ یہ زخم کبھی مندمل نہ ہو سکنے کے باعث جدید نو آبادیاتی ناسور میں ڈھل گئے ہیں اور چارہ گر ثقافتی، سماجی و انسانی درد و اذیت سے بے خبر علاج کی طرف متوجہ نہیں اور اگر کسی مجبوری کے تحت زحمت اٹھائی بھی جاتی ہے تو اس چارہ گری کی عدم توجہی، بے کاری اور اناڑی پن اذیتوں میں اضافے کا ہی سبب بنتا ہے اندمال کا نہیں۔ ملک عزیز کے انتظامی و تربیتی شعبے بالخصوص نظام تعلیم اس عمل کی بیّن مثال ہے۔ اس ساری تمہید کا مقصد امت مسلمہ جو مندرجہ بالا اسباب و علل کے باعث" امت مرحوم" میں ڈھل چکی ہے کی سماجی، اخلاقی اور روحانی صورتحال کو نشان زد کرنا تھا کہ جو نہ ایک صدی پہلے اپنی حیاتی و اخلاقی صورتحال کو بدلنے کو تیار تھی نہ اب ہے۔ سو" شکوہ" سے" جواب شکوہ" تک کا منظر نامہ ماضی نہیں موجودہ صورتحال کا بھی ایک حصہ ہے اور ہر اس دور کا نمائندہ کے جہاں عالم بے عمل، ہنر مند و فنکار بے ہنر وتن آسان، جہد و محنت کے حامل لوگ کاہل الوجود، حکمران عیاش اور رہنما حریص ہو جائیں تو زوال اور مسلسل زوال مقدر بن جاتا ہے۔ اب پلٹیے اس مشرقی نو آبادیات کی طرف کہ جس کے ایک ملک ہندوستان میں اقبال جیسا شاعر پیدا ہوا، ایک ایسا ملک کہ جس کے 35 کروڑ انسانوں پر محض چند ہزار انگریزوں نے من مانی و من چاہی حکمرانی کی اور مقامیوں کی انسانی شناخت جانوروں سے بھی بدتر ہو گئی۔ سونے کی چڑیا India کے سنہرے انڈوں سے چار دانگ عالم میں اپنی طاقت اور علم و امارت کی دھاک بٹھانے والی سلطنت برطانیہ کے سامنے اس سونے کی چڑیا کے بچے اس قدر بے وقعت اور ذلیل تھے کہ

Dogs and Indians are not allowed

کا سلوگن ہی ان کی شناخت ٹھہرا، سجاد ظہیر کے الفاظ میں :

"خیال تو کرو 35 کروڑ انسان اور ایک لاکھ سے بھی کم انگریز ان پر مزے سے حکومت کرتے ہیں اور حکومت بھی کیسی حکومت! ہندوستان میں ذلیل سے ذلیل انگریز کا رتبہ بڑے سے بڑے ہندوستانی سے بڑھ کے ہے ۔ یہاں انگلستان میں چاہے انگریز مرد ہمارے جوتے صاف کرتے اور انگریز لڑکیاں ہم سے محبت کرتیں مگر سوئز کے اس پار تو ہم سب" کالا لوگ" نیٹوز غلاموں سے بدتر سمجھے جاتے ہیں ۔ میں بیرسٹر ہو جاؤں اور تم انجینیئر مگر ہندوستان میں وہی "نیٹو" کے "نیٹو" ہو گے اور انگریزوں کی ٹھوکریں کھاؤ گے اور باوجود کے پھر الٹ کے انھیں کو" سرکار سلام"، "خداوند" اور

"مائی باپ" کہو گے"

"دس انگریزی سپاہیوں نے 10 ہزار

نیٹوز کو فساد کرنے سے روکا ایک گورا

زخمی ہوا اور 15 نیٹوز کی جان گئی" (۵)

یہ ہے نو آبادیاتی غلامی کی اک چھوٹی سی جھلک کہ جہاں ہندوستانیوں کا خون انگریز کے پسینے سے بھی سستا ہے ۔ اور ان ہندوستانیوں میں مسلمان تو پستی اور انحصال میں ہندوؤں سے بھی بدتر ہیں کیونکہ مذہبی دباؤ پہ جدید علوم سے دوری ، امرا کی عیاشی ، غربت میں عظمت اور ظلم پہ صبر کی عادت کے باعث وہ غلاموں کے بھی غلام ہو چکے تھے ۔ ایسے میں اقبال جیسے چند رہنما روشن خیالی اور مسلمانوں کی ذہنی قلبی ، سماجی و علمی کایا کلپ کے شدت سے خواہشمند تھے مگر ہزار مراحل جاں کاہ سدّ راہ تھے ۔ مگر وہ قلم اور زبان سے جہاد کو شعار بناتے ہوئے "شکوہ" کی صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں ۔ اس بات سے فرار ممکن نہیں کہ خدا سے روبرو مکالمے اور گلے کا یہ حوصلہ بھی نو آبادیاتی عہد و علم کا عطا کردہ ہے ۔ کیونکہ روایتی مذہبی تعلیم میں بندے کا خدا سے براہ راست شکوہ یا سوال نافرمانی اور بعض شدت پسند حلقوں میں تو" کفر" کے مقام پر جا ٹھہرتا ہے ۔ یہ انگریزی قوانین کا استحکام ، جدید انگریزی تعلیم اور انگریز کا سکھایا معروضی نقطہ نگاہ ہے کہ جو کائنات میں بشر کو مرکزیت اور اہمیت تفویض کرتے ہوئے اسے اس حد تک کو حوصلہ مند کر دیتا ہے کہ وہ دین ساختہ حقائق ، مفروضات اور متعینات کے روبرو اپنی عقل و ہمت کے بل بوتے پر سوال کرنے اور جواب طلبی کی جرات کر سکے ۔ حالانکہ ماضی میں الکندی ، ابن رشد ، بوعلی سینا ، ابن خلدون اور فارابی جیسے نابغانِ فن کو اپنی عقلیت و جدّت پسندی کا بھگتان بھگتنا پڑا تھا۔

اے خدا شکوہ ارباب وفا بھی سن لے　　خوگر حمد سے تھوڑا سا گلا بھی سن لے(۶)
تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام تیرا　　قوت بازوءِ مسلم نے کیا کام تیرا(۷)
پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں　　ہم وفادار نہیں تو بھی دلدار نہیں(۸)
خندہ زن کفر ہے احساس تجھے ہے کہ نہیں　　اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں(۹)
طعنہ اغیار ہے رسوائی ہے ناداری ہے　　کیا تیرے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے(۱۰)
آئے عشاق گئے وعدہءِ فردا لے کر　　اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر(۱۱)

استعماری طاقتیں جو ماضی سے اب تک خود کو علم بطور طاقت کا نمائندہ اور علمی برتری کی بدولت حکومت و اقتدار کا حقدار گردانتی آئی ہیں جدید اسلامی شعرا و مفکرین کے غیر روایتی اظہارات و استفہامات کے تناظر میں حق بجانب نظر آتی ہیں کہ قابض اقوام اگر محکوم آبادیوں سے مالی منفعت حاصل کرتی ہیں تو بدلے میں انہیں جدید علوم، ثقافت، انسانی حیات و شناخت کے قرینے، صنعت و حرفت کی ترقی، وقت و زمانے سے ہم آہنگ ہونے کے زاویے اور جدید تہذیب و تمدن کے راستے بھی ہموار کرتی ہیں اور سب سے بڑھ کر فکری تشکیک اور استفہامی نقطہ نگاہ جو صدیوں کے جمود اور مذہبی اجارہ داری کو چیلنج کرتے ہوئے خدا کے مقابل بندے کی شناخت متعین کرتا ہے اور خدا ہی کی طرف سے انسانی تخلیق میں شامل کردہ اس فعال تخلیقی عنصر کو نشان زد کرتا ہے کہ جو موجودات و متعینات کی حقیقت پر سوال اٹھاتا کھوج پر مائل کرتا اور کسی بھی حقیقت، وجود، تصور یا شے کو قبولنے سے پہلے جانچنے کی دعوت دیتا ہے۔ یہ دعوت حقیقی علم اور مقصد تخلیق کائنات و انسان ہے جسے بعد ازاں مذہبی حرمت کے نام پر معطل کر کے مذہب کے پردے میں انسانی اجارہ داری کی راہ ہموار کی گئی۔ صرف مشرق ہی کیوں مغرب بھی صدیوں تک اسی اجارے کا شکار رہا تاوقتیکہ علم و سائنس کی طاقت اس کے ہمراہ ہوئی اور کلیسا کے طوق سے انسان و سماج کی گردن آزاد ہوئی۔ "شکوہ" کی جراءت اظہار اور دینیاتی و روایتی جکڑ بندیوں سے دور ایک آزادہ رو بلکہ کسی حد تک چیلنجنگ پکار نو آبادیاتی نظام کے نئے علمی ڈسکورس کی نمائندہ ہے کہ جہاں علم طاقت اور آگہی حرمت ہے۔ جہاں حاکم و محکوم کا تعلق غلام و آقا سے اس صورت میں بدل سکتا ہے کہ جب محکوم حاکم کی طاقت کا سرچشمہ یعنی علم تک رسائی حاصل کر کے اسے آزادانہ استعمال کے قابل ہو یہ حاکم خدا بھی ہے اور بندہ بھی مگر ان دونوں کی طاقت کے زاویے اور وسعتیں انسانی ردِعمل کے چھپے اسرار کھولتی ہیں۔ اقبال کا ذہنی و شعری ارتقا اس حقیقت کو آئینہ کرتا ہے کہ مغربی لسانی آموزش اور علوم کے حصول نے ان کی روایتی فکر کو ہی نہیں بدلا تھا بلکہ ان کے اندر کے روایتی فرد کو بھی بدل ڈالا تھا۔ قیام یورپ اقبال کی زندگی کا سنہرا ہی نہیں

آزمائشی دور بھی ہے کہ جہاں وہ دو انتہاؤں یعنی لا مذہبیت اور آزاد روی اور اپنے روایتی پندار و تشخص کی بقا کے لیے کٹھ حجتی اور شدت پسندی یا پھر سرسید احمد خان کی طرح مذہبی APOLOGY کے معذرت خواہانہ، احساسِ کمتری بلکہ کسی حد تک شرمسار رویے کے درمیان توازن کی راہ اختیار کرتے ہوئے مشرقی و مغربی دونوں تہذیبوں کے افق پر غیر جانبدارانہ اور حقیقت پسندانہ نگاہ ڈالتے ہیں اور خالص انسانی رویے کا اظہار کرتے ہوئے عمل اور ردِ عمل کی صورتحال کو آفاقی و زمینی حقائق کے تناظر میں پیش کرتے ہیں۔ یوں "شکوہ" کے شکایتی اور کسی حق تک چبھتے ہوئے اشعار شکایت و طعنے سے پہلے حقائق و دلائل کی کمک اکٹھی کرتے ہوئے برسرِ میدان آتے ہیں۔ مسلمانوں کی ابتری پسماندگی اور مظلومیت پر کڑھنے والا فرد جو خود بھی اسی درماندگی و بدحالی کا حصہ ہے نو آبادیاتی علوم و فکر سے روشناس ہو کر جہل و پسماندگی کی تاریک راہوں کو ترک کرنے کی سعی کرتا صدیوں کے روایتی مذہبی اقتدار کو چیلنج بھی کرتا ہے اور استعماری حکمرانوں کے ظلم و اجارہ کے چہرے سے نقاب بھی کھینچتا ہے کہ اس کی قوم کی بدحالی مظلومیت اور کسمپرسی کی ایک بڑی وجہ یہ نو آبادیاتی حاکم بھی ہیں کہ جو صدیوں سے مشرق تا مغرب شمال تا جنوب شاعر کی قوم جیسی متعدد اقوام کو اپنے حرص و اقتدار کا ایندھن بنائے ہوئے ہیں۔ گو کہ اس میں خود محکوم قوموں کے انداز فکر و عمل کو بھی بڑا ہاتھ ہے کہ جو حکمت عملی سے عاری، مذہبی ڈگر کے نام پر جدت و وقت کے تقاضوں کے تحت چلنے سے خوفزدہ، جاگیر دارانہ مظالم کی عادی، اساطیری خوابوں کی دیوانی، جہد و عمل سے جان چھڑانے والی خوشامد پسند، منافق، تن آسان، حریص اور بیکار ہوتی ہیں۔ ایسے میں ان تمام خامیوں کے برعکس مدمقابل جب ان پر قابض ہوتے ہیں تو محکوم قوم غلامی سے جدوجہد کے باوجود مکمل چھٹکارا نہیں پا سکتی کیونکہ وہ علمی و عملی برتری کے حامل آقاؤں کی اس حکمت عملی کا شکار ہو چکی ہوتی ہے کہ کہ وہ کچھ بھی کر لیں اپنے آقا کے برابر یا ان سے برتر نہیں ہو سکتی۔ ایسے میں ان کا تمام تر ثقافتی، دینی و علمی سرمایہ بے کار ٹھہرتا ہے اور نو آبادیاتی باشندے اپنی آنکھیں آقاؤں کو گروی رکھ کے فقط وہ دیکھتے ہیں جو آقا انہیں دکھاتے ہیں اور اس راہ چلتے ہیں جس پہ آقا انہیں چلاتے ہیں اور وہی سمجھتے ہیں جو آقا انہیں سمجھاتے ہیں یہاں تک کہ ان کا اپنا تشخص بھی آبادکار آقا ہی کی مرہون منت ہے۔ ایسے میں محکوم قوم کا ماضی، نسلی امتیاز و افتخار، تاریخ کے روشن حقائق، اقتداری و علمی برتری، عددی قوت سب بے معنی ہو جاتی ہے اور آزادانہ غلامی کی ایک نئی صورت سامنے آتی ہے کہ جو بظاہر تو ہر طوق و زنجیر سے آزاد مگر بباطن ان کی روح تک محکوم ہوتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال ہندوستانی فکرِ نو تھی کہ جس کے علمبردار سرسید اور ان کے رفقا تھے۔ جدّت و جدید علوم کے نام پہ مغرب نے جس لامتناہی و پرشکوہ اجارے کی بنیاد رکھی اس کی جڑیں آج بھی مشرق میں علمی بے چارگی، معاشی عدمِ استحکام، نفسیاتی ضعف اور ثقافتی پسماندگی کی صورت موجود ہیں۔ ہندوستان میں انگریزوں کے مقابل علمی و عملی میدان میں

سامنے آنے والا پڑھا لکھا طبقہ دراصل اس کٹھ پتلی سے مشابہ تھا کہ جو ڈور تھامنے والے ہاتھوں کی اجازت کے بنا ہل بھی نہیں سکتی۔لارڈ میکالے کا نسلی وعلمی تفاخر و برتری اس تعلیمی پالیسی کی تجاویز سے عیاں ہے کہ جس میں اس نے تمام تر ہندو و مسلم علمی ادبی سرمائے کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا تھا کہ:

A single shelf of a good European library was"

Worth the whole native literature of India and

Arabia."(12)

It is, I believe, no exaggeration to say that"

All the historical information which has been

Collect from all the books written in Sanskrit

Language is less valuable than what may be

Found in the most paltry abridgments used

At preparatory schools in England".(13)

جبکہ حکومتی استحکام وترویج کے لئے انہیں جس نوع کے نمائندے درکار تھے،اس کے لئے:

We must at present do our best to form a class who"

May be interpreting between us and the millions whom

We govern, a class of persons, Indians in bloods&colour

But English in taste, in opinion, in morals&in intellect".(14)

مغربی نو آبادیات کا یہ طویل مدتی اجارہ تمام مقبوضہ خطوں میں زمینی،ثقافتی وانسانی صورتحال میں بظاہر مغربی قبضہ ختم ہوجانے کے بعد بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔اقبال کے شکوہ کا عمومی تاثر گو فریاد و گلے سے ہی مہمیز پاتا ہے مگر اس کی زیریں تہ میں الجھن و بے بسی کی وہ ساری صورتحال آئینہ ہے کہ جو اس وقت مغربی استعمار کے ہاتھوں تمام امتِ مسلمہ کو لاحق تھی۔یہ تکلیف خود اپنوں کے انتشار،ہوس وجاہ پرستی اور نالائقیوں کی صورت بھی سامنے آتی ہے اور عیارو کام گار دشمن کی پیدا کردہ صورتحال میں بے کسی ومجبوری کی صورت بھی۔ایسے میں عمل سے عاری شکست

خوردہ انسان اپنے دائمی بھروسے یعنی" رب" سے اس کی بے اعتنائی کا شکوہ" کہ ہم تو کچھ کر نہیں سکتے تو ایسے میں تو،تو کچھ کر" کی خواہش دراصل انسانی قلبی بہلاوے کی صورت لمحاتی تشفی تو ضرور بنتی ہے مگر ہر سوال خود اپنا جواب بن کر " جوابِ شکوہ" کی صورت :

" وان لیس للانسان الا ما سعی" (15)

کا صحیفہ کھولتا ہے تو" شکوہ" کی تاریخی صورت حال جس دورخے پن کو آئینہ کرتی ہے اس کا عملی نتیجہ کہ جسے خدا کے کھاتے میں ڈال دیا گیا تھا" جواب شکوہ" کی صورت معذرت خواہی کرتا ہے۔آزادانہ غلامی کا منظر نامہ" شکوہ" ہی کے تناظر میں عالمی امت مسلمہ کے کردار و عمل کی صورت اپنا جلوہ دکھاتا ہے کہ جہاں کردار کے غازی گفتار سے بھی عاری نظر آتے ہیں۔ قیصر و کسری کو زیر و زبر کرنے والے چھوٹے چھوٹے مفادات پہ اپنی دھرتی تو کیا اپنے ضمیر کا سودا کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔خدا کے نام پر مرمٹنے والے نسلی و علاقائی تعصب میں ایک دوسرے کے خون و عزت کے درپہ ہیں۔" شکوہ " بظاہر ماضی کی فتوحات خدا کے نام پہ زمین و آسمان کے مقابل مسلمان لشکروں کی گھن گرج ،بحر ظلمات کو روند ڈالنے ،تلواروں کے سائے میں جاں سپاری کی خواہش وخود سپردگی اور دین خدا کی آبیاری کے لیے مسلم خون کے دریاؤں کی روانی سے عبارت ہے مگر ردعمل کے طور پر عصرِ حاضر کی ابتری میں شامل ان تمام اسباب وعلل کو کھول کے رکھ دیتا ہے کہ جو تمام تر نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی مسلم ممالک میں اپنوں اور غیروں دونوں کی طرف سے کارفرما ہیں۔

آیئے" شکوہ و جواب شکوہ" کے عہد کی اسلامی سلطنتوں کے ارضی مسائل و اثرات کے پس منظر و پیش منظر پر نگاہ ڈالتے ہیں۔جذبات وجود انسانی کا لازمی حصہ ہیں لیکن المیہ یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے مذہبی حوالے سے یہ جذبات وجودی کُل اور کُل بن جاتے ہیں۔سو" شکوہ" کو سمجھنے کے لیے بھی ہندوستان ہی نہیں ہندوستان سے باہر کے اسلامی منظر نامے کو بھی نگاہ میں رکھنا ضروری ہے بالخصوص مشرقی وسطی اور سلطنت عثمانیہ کی خلافت کہ جہاں سے ہندوستانی مسلمان اپنے ہونے کو جواز فراہم کرتے ہیں۔" شکوہ" کے عہد میں ہندوستانی مسلمانوں کے ایمان کا مرکز مشرق وسطی اور حجاز کی سرزمین تھی اور ان ممالک میں اٹھنے والی تبدیلی کی ہر لہر ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بھونچال بن جاتی تھی اور شدت جذبات میں وہ اتنا تن من دھن قربان کرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔تیرھویں صدی عیسویں میں آغاز کرنے والی سلطنت عثمانیہ اپنے عروج کے سنہری آسمان پہ متمکن رہ کر بالآخر سترھویں صدی عیسوی میں زوال کی طرف بڑھنے لگی۔1683ء میں ویانا مہم میں ناکامی عثمانی سلطنت کے زوال کا نقطہ آغاز تھا1699ء میں

معاہدہ کارلوٹس کے تحت انہیں ہنگری سے بھی دستبردار ہونا پڑا اس کے بعد یہ سلطنت بتدریج اپنے زوال کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی کے وسط تک بحر و بر پر اپنی برتری وقوت کے فسانے رقم کرنے والا ترکی The Sick men of Europe "یورپ کا مرد بیمار" کہلانے لگا۔ اور ماضی کی یہ خود مختار اور طاقتور سلطنت آنے والے وقت میں یورپی نو آبادی بن کر رہ گئی اس سلطنت کی بے بسی کا اندازہ زار روس نکولس اول کی اس تجویز سے ہوتا ہے کہ جو اس نے برطانوی نمائندے سے بات کرتے ہوئے دی کہ "اس مرد بیمار کے مرنے سے پہلے ہی ہمیں اس کی جائیداد آپس میں مناسب طریقے سے تقسیم کر لینی چاہیے" (16) بیرونی ستم و استبداد کے ساتھ ساتھ اندرونی خلفشار اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ سلطنت عثمانیہ میں شامل بعض مسلمان حکومتیں اندرونی مسلم غلبے سے آزادی کی خواہش میں رفتہ رفتہ یورپین نو آبادیات میں ڈھلتی گئیں۔ برطانیہ نے 1815ء میں مالٹا پر 1878ء میں قبرص پر اپنا تسلط قائم کیا 1883ء میں مصر پر عملاً اس کا قبضہ مکمل ہوا سوڈان کو لارڈ کچنر نے 1898ء میں فتح کیا جبکہ فرانس الجزائر، تیونس اور مراکش کا حاکم بنا۔ نو آبادیاتی قبضے کی دوڑ میں اٹلی چند قدم پیچھے تھا سو اس نے افریقی ساحلوں پر موجود حکومتوں میں غیر محکوم رہ جانے والے طرابلس پر 29 ستمبر 1911ء میں حملہ کر کے قبضہ کرنے کے ساتھ ساتھ جزائر دوازدگانہ اور روڈز کو بھی اپنی نو آبادی میں شامل کر لیا۔ انور پاشا بھیس بدل کر طرابلس پہنچے۔ قبائلیوں کو منظم اور مستعد کر کے شدید مزاحمت کی ،قریب تھا کہ فتح یاب ہو جاتے مگر جنگ بلقان کا خطرہ پیدا ہو گیا 8 اکتوبر 1912ء کو "صلح نامہ نوران" کی رو سے ترکوں کو مجبوراً طرابلس سے دستبردار ہونا پڑا ۔ یہ تو تھا بیرونی استبداد لیکن اپنوں کی ستم ظریفی اس سے بھی بڑھ کے تھی کہ جس کے زہر نے "مرد بیمار" کے لیے کسی دوا اور حیلے کو کارگر نہ ہونے دیا۔ داخلی خلفشار کا بھیانک نتیجہ 1908ء کی دستوری اصلاحات تھیں کہ جو نوجوان ترکوں کی بغاوت کے نتیجے میں عمل میں آئیں لیکن ستم تو یہ کہ نوجوانوں کی اقتداری جماعت بھی آپس میں متحد نہ تھی یوں غیر متحد اور حریص اقتداری ٹولہ جنگ بلقان میں بری طرح ہزیمت سے دو چار ہوا اور ترکی کے بہت سے دیگر علاقے بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے ترک اس قدر کمزور نہ تھے کہ انہیں اس بری طرح شکست کھانا پڑتی تھی لیکن برا ہوا ان کی نا اتفاقی اور باطنی خلفشار کا کہ جس نے نہ صرف جنگ میں شرمناک شکست دکھلائی بلکہ ترکوں کا بھرم بھی استعماریوں پہ کھول دیا۔ 1914ء میں جنگ عظیم دوم کے آغاز تک ترکی یورپ میں اپنے تمام مفتوحہ علاقوں سے ہاتھ دھو چکا تھا سوائے مشرقی یونان کے لیکن یہاں بھی استعماریوں کی طاقت اور شکست کا خوف سایہء زوال بن کے ترکوں کے سر پر منڈلا رہا تھا۔ ترکی جنگ عظیم میں غیر جانبدار رہنا چاہتا تھا مگر اس میں اس قدر طاقت و ہمت

باقی نہ تھی کہ وہ اپنے فیصلے پہ قائم رہ سکتا یوں کل کے فاتح عظیم کو مجبوراً اس جنگ میں شریک تو ہونا پڑا مگر یہاں بھی اندرونی خلفشار تقاضائے وقت کو سمجھنے سے قاصر کشمکش و آویزش میں رہے سہے وقار اور سلطنت کو داؤ پہ لگانے سے چوک نہیں رہا تھا۔ بہرحال اس وقت کی غالب قوت ترک نوجوانوں کا ایک گروہ کہ جس کی قیادت غازی انور پاشا کے ہاتھ میں تھی روس سے دیرینہ دشمنی کی بنا پر مخالف گروپ جس میں جرمنی (جو روس کا سخت مخالف تھا اور روس ترکوں کا دیرینہ دشمن) سے اتحاد کا حامی تھا یوں ترکی نے ایک خفیہ معاہدے کے ذریعے جرمنوں کی اعانت وحمایت کا فیصلہ کیا اس معاہدے کی بھنک جب مدمقابل اتحادیوں یعنی روس، برطانیہ اور فرانس کو ملی تو انہوں نے علی الاعلان ترکی کے خلاف جنگ کا آغاز کر دیا۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی 1908ء میں نوجوان ترکوں نے سلطان عبدالحمید ثانی کی مخالفت کے باوجود شاہ حسین کو مکہ کا شریف یعنی گورنر مقرر کر دیا انگریزوں نے کرنل لارنس المعروف بہ "لارنس آف عریبیہ" کو ملک عربیہ بھیجا تاکہ عربوں اور ترکوں کے افتراق کی خلیج مزید وسیع ہو سکے کرنل لارنس نے یہ کام نہایت مستعدی سے سرانجام دیا اس کی کوششوں سے ایک طرف تو عربوں کے دلوں میں عجمیوں کے لیے قطرہ قطرہ جمع ہوتی نفرت اور نسلی و قبائلی تفاخر دریا بن کر موجزن ہوا دوسری طرف خود ترکوں کا مقرر کردہ شاہ حسین دائمی اقتدار کے لالچ میں ترکوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا 10 جون 1916ء کو شاہ حسین نے حجاز کی بادشاہت کے لالچ میں ترکوں کے خلاف بغاوت کر کے انہیں دھوکہ دیا جبکہ اس عمل سے ایک ماہ پہلے ہی اتحادی "The sky picot agreement" کے تحت تمام ممالک عربیہ کو آپس میں تقسیم کرنے کا خفیہ معاہدہ کر چکے تھے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اس معاہدے کا علم ہو جانے کے باوجود ہوسِ اقتدار میں اندھے شاہ حسین نے ہر قسم کی نصیحت، حمیت و اخلاقیات کو پس پشت ڈال کر ترکوں سے علیحدگی اختیار کر لی اور اکتوبر 1916ء میں اپنے شاہ حجاز ہونے کا اعلان کر دیا انگریزوں نے اس اقدام کو سراہتے ہوئے نہ صرف اس کی حوصلہ افزائی کی بلکہ اس کی مدد اور پشت پناہی کا وعدہ بھی کیا۔ شاہ حسین کے بیٹے نے لارنس آف عریبیہ کی اعانت سے ترکوں کو شام سے وطن بدر کر دیا۔ یوں 1917ء تک شام و فلسطین کے بڑے حصے پر انگریزی اقتدار قائم ہو گیا 10 دسمبر 1917ء کو جنرل ارل ایلنبی فاتحانہ انداز میں بیت المقدس میں اس اعلان کے ساتھ داخل ہوا کہ "آج کروسیڈ ختم ہوا" یوں صلاح الدین ایوبی کی فتح یروشلم 1187ء کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ جب بیت المقدس دوبارہ عیسائیوں کے ہاتھ میں چلا گیا یہ حادثہ اتنا بڑا تھا کہ اس نے ہر حساس مسلمان کو جھنجھوڑ ڈالا اور مسلمان گھرانوں میں صف ماتم کی کیفیت در آئی۔ 1918ء تک عرب کے تمام علاقے حجاز، شام، لبنان، عراق ترکوں کے ہاتھ سے نکل کر

انگریزوں کی نو آبادی میں ڈھل گئے۔ یہ وہ اجتماعی زوال اور ابتری و شکستگی کی صورتحال ہے جسے اقبال مسلمانوں کے داخلی خلفشار سے نتیجہ برآمد ہونے کے کئی سال پہلے بھانپ چکے تھے سو جب ان کے لبوں سے یہ آہ نکلتی ہے کہ:

بت صنم خانوں میں کہتے ہیں مسلمان گئے ہے خوشی ان کو کہ کعبے کے نگہبان گئے
منزلِ دہر سے اونٹوں کے ہدی خان گئے اپنے بغلوں میں دبائے ہوئے قران گئے(۱۷)

تو گویا مقدر پہ شاکی، ہاتف کی صدا اور غیبی مدد کا طلبگار روایتی مسلمان بے بسی کے احساس میں اپنی انسانی وزمینی صورتحال سے صرفِ نظر کرتے ہوئے جھنجھلا کر خدائی حمیت کو جھنجھوڑنے کی کوشش کرتا ہے۔

خندہ زن کفر ہے احساس تجھے ہے کہ نہیں اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں(۱۸)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ حادثہ خود اپنے ہونے کا جواز ہے سو فوری اور غیر متوقع چوٹ کے اثر سے چیخ و افسوس کا مرحلہ جب گزر جاتا ہے تو حادثہ ہر صاحب شعور کو اپنے ہونے کی توجیہ بیان کرتا ہے۔ "شکوہ" جس حادثے کا شاخسانہ ہے مسلمانوں کا کردار و عمل اس کا لازمی و فطری نتیجہ ہے یوں" جواب شکوہ" دراصل "شکوہ" پہ تنقیدی ردعمل کا اظہار یہ نہیں بلکہ حالات پہ بہ نظر غائر سوچ بچار کا نتیجہ بن کر سامنے آتا ہے کہ جب کوئی سچا اور غیر جانبدار انسان خود احتسابی کی طرف مائل ہوتا ہے تو شکست و ہزیمت کی وجوہات روشن ہونے لگتی ہیں۔ ایسے میں غلطیوں کا ادراک ہی غلطیوں کی تلافی بنتا ہے شکست کی قبولیت ہی فتح کی جانب قدم بڑھاتی ہے اور فطری مسلمات کی قبولیت سے ہی انسانی کردار عظمت سے ہم کنار ہوتا ہے۔ سو جب" جواب شکوہ" میں اقبال خدا کی طرف سے اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ:

تم ہو آپس میں غضب ناک وہ آپس میں رحیم تم خطا کار و خطا بیں ،وہ خطا پوش و کریم
چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوج ثریا پہ مقیم پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلب سلیم
تخت فغفور بھی ان کا تھا سریر کے بھی یوں ہی باتیں ہیں کہ تم میں جمیعت ہے بھی(۱۹)

تو وہ مذہبی طور پر اپنی بے باکی و جرات اظہار پہ تلافی نہیں کرتے بلکہ زمینی صورتحال میں حقائق کا ادراک کرتے ہوئے آنے والے عہد کا نقشہ مرتب کرنے اور امتِ مسلمہ کو تنبیہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ میدان جنگ اسی کا ساتھ دیتا ہے جو لڑنا جانتا ہے۔ دھوکہ دینے والا دغا کرنے والا کلمہ پڑھنے کے باوجود اپنے عمل کے ذریعے اسی نظام حیات کی نفی کر رہا ہوتا ہے کہ جس کے نام لیوا کی حیثیت سے وہ زمانے میں اپنی شناخت و عزت مستحکم کرتا ہے مگر جب وہ رحمن کے راستے کو چھوڑ کے شیطان کا راستہ اختیار کرتا ہے تو قانون قدرت اور قانون فطرت دونوں برسر عمل آتے

ہوئے اسے زمانے میں ذلت کا نشان بنا دیتے ہیں۔شاہ حسین جنگ عظیم کے بعد اپنے دھوکے کا شکار ہوا ترکی میں خلافت معطل اور جمہوریت اس طور فعال ہوئی کہ مسلم اور غیر مسلم میں فرق کرنا مشکل ہو گیا۔فلسطین پہ یہودی قابض ہوئے اور ہندوستانی مسلمانوں نے آگ وخون کا دریا پار کر کے جس وطن کو حاصل کیا وہ آج تک عوام کے خوابوں کی تعبیر نہ بن سکا چنانچہ اقبال جب بذبان خداوندی اس فرمان کو جاری کرتے ہیں کہ

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں　　راہ دکھلائیں کسے راہ روِ منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے جو ہر قابل ہی نہیں　　جس سے تعمیر ہے ہو آدم کی یہ وہ گل ہی نہیں
کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں　　ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں(۲۰)

تو نہ صرف وہ ماضی کی غلطیوں اور حال کی شکستوں کی توجیہ بیان کرتے ہیں بلکہ مستقبل کے تعینات کو نشان زد کرتے ہوئے مسلمانوں کو اسی ملی، اخلاقی، دینی اور ادراکی صلاحیتوں کی طرف مائل ہونے پر اکساتے ہیں کہ جس نے اونٹ چرانے والے عربوں کو آئین جہاداری کا پاسدار کر دیا تھا مگر افسوس کہ زوال کی یہ رات اس قدر طویل ہے کہ اس کی حقیقی صبح ابھی تک طلوع نہیں ہو پائی اور ترکی سے لے کر عرب کے اطراف اور خود ملک عزیز بھی بظاہر آزادی سے ہمکنار ہونے کے باوجود سیاسی اور ثقافتی طور پر اسی نو آبادیاتی حصار میں ہیں کہ جس سے ایک عرصہ پہلے وہ جدوجہد کر کے آزاد ہو چکے تھے۔اس مابعد نو آبادیاتی غلبے کی بڑی وجہ یورپی استعمار کی دورس پالیسیاں اور احساسِ برتری کا وہ کلٹ ہے کہ جس کا آغاز سلطنتِ برطانیہ نے مقبوضہ نو آبادیات میں اپنے غلبے کے ساتھ ہی کر دیا تھا جس کا اثر ونفوذ مغرب نواز تعلیمی وانتظامی پالیسیوں کی صورت آج تک بحال ہے۔یوں "شکوہ وجوابِ شکوہ" محض ایک فریاد و بکا یا گلا وشکایت نہیں رہتا بلکہ عہد جدید کی اجتماعی اسلامی تاریخ کہ جو ہنوز نو آبادیاتی عہد سے عبارت ہے، اسے عمل و ردعمل ہر دو حوالوں میں حقیقت کا آئینہ بناتے ہوئے آنے والے دور تک کے مناظر کو واضح کرتا ہے کہ اگر مسلمان اب بھی خواب غفلت سے بیدار نہ ہوئے تو ان کا مقدر عزت کی موت نہیں ذلت کی زندگی ہوگا۔

حواشی وحوالہ جات

ا۔نظم "شکوہ" اقبال نے سب سے پہلے 3اپریل 1911ء کو "انجمن حمایتِ اسلام" کے چھبیسویں اجلاس منعقدہ ریواز ہوٹل، اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور کے جم غفیر میں پڑھی۔اس جلسہ میں اقبال کے والد شیخ نور محمد بھی موجود تھے۔عمومی طور پر اقبال کو جو نظم پڑھنا ہوتی تھی وہ پہلے چھپوالی جاتی اور بعد میں اس کی کاپیاں جلسہ کے شرکا خرید لیتے تھے۔جو رقم حاصل ہوتی وہ انجمن کے فنڈ میں جمع کروادی جاتی۔مگر "شکوہ" پڑھنے سے پہلے چھپوائی نہیں گئی تھی اور علامہ نے اسے خلافِ معمول ترنم کی بجائے تحت اللفظ پڑھا۔لوگوں کی فرمائش پر کہا:

"یہ اسی طرح سنائی جائے گی کیونکہ میں بہتر جانتا ہوں کہ نظم پڑھنے کا کون سا طریقہ موزوں ہے۔اقبال نے آغاز ایک قطعے سے کیا اور اس قدر دلآویز انداز میں یہ نظم پڑھی کہ" جن خوش نصیبوں نے سنی وہ اسے زندگی کے آخری لمحوں تک نہ بھولیں گے" (غلام رسول مہر، دیباچہ" سرورِ رفتہ" ص 6) "شکوہ" کی وہ کاپی کہ جو اقبال اپنے ساتھ لائے تھے، ذوالفقار علی خان نے ایک سو روپے میں وصول کی، اقبال کے بڑے مدّاح اور قدر شناس خواجہ عبدالصمد نے اپنا قیمتی دوشالہ ستائش میں اقبال کی نظر کیا جسے وہیں نیلام کر کے رقم انجمن کے فنڈ میں جمع کروادی گئی۔ "جوابِ شکوہ" 1913ء میں منظرِ عام پر آئی، رفیع الدین ہاشمی کے مطابق : "شکوہ" چونکہ ایک نوع کا سوال تھا تو اقبال کے ذمّے اس کا جواب لازم تھا چنانچہ" جوابِ شکوہ" شکوہ" کا لازمی نتیجہ ہے۔یہ نظم اقبال نے بیرون موچی دروازے کے ایک جلسۂ عظیم میں پڑھی اور "شکوہ" ہی کی طرح اس کی از حد ستائش و قبولیت ہوئی اور اس کے ہر شعر کے عوض ایک گراں قدر رقم اکٹھی کر کے" جنگِ بلقان فنڈ میں جمع کروائی گئی۔

۲۔نو آبادی غیر ملکی قبضہ کا وہ خطہ ہوتا ہے کہ جہاں غیر ملکی حکمران مقامیوں پر اپنی حکومت قائم کر کے ان کے ملکی وانسانی وسائل کو اپنے مفادات کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ویکیپیڈیا کے مطابق: جہاں یہ نو آبادی قائم کی جاتی ہے وہاں کے اصل باشندوں پر یہ قابض گروہ عموماً اپنے قوانین، معاشرت اور حکومت بھی مسلّط کر دیتا ہے۔بنیادی طور پر قابض گروہ اور نو آبادی کے اصل باشندوں کے درمیان ناانصافی اور جبر پر مبنی ایک تعلق ہوتا ہے جس میں اصل باشندوں کا استحصال کیا جاتا ہے۔

۳۔ایڈورڈ سعید، "Culture and Imperialism" ونٹاژ، انگلینڈ، 1994ء ص 6

۴۔ڈاکٹر ناصر عباس نیرّ" مابعد نو آبادیات: اردو کے تناظر میں" آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کراچی، 2013ء، ص 4

۵۔سجّاد ظہیر" لندن کی ایک رات" نیشنل بک ٹرسٹ نئی دہلی انڈیا، 2005ء ص 10

۶۔محمد اقبال: ڈاکٹر علامہ،" شکوہ جوابِ شکوہ"، (نثری ترجمانی، الحاج امیر اللہ عنبر خلیقی) شاہد پرنٹرس ناگپور، 2010ء، ص 7

۷۔ایضاً ص 8 ۸۔ایضاً ص 12 ۹۔ایضاً ص 12 ۱۰۔ایضاً

۱۱۔ایضاً ص 13

12۔Minutes on Indian Education by Thomas Babington Macaulay, BYSUS, http: //by jus.com

۱۳۔ایضاً ۱۴۔ایضاً ۱۵۔سورہ" النجم" آیت نمبر 39

۱۶۔رفیع الدین ہاشمی،" اقبال کی طویل نظمیں : فنی و فکری مطالعہ"، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، 1985ء، ص 13

۱۷۔"شکوہ جوابِ شکوہ" ص 12 ۱۸۔ایضاً

۱۹۔ایضاً

فروغِ اردو میں اقبال کی خدمات کا مختصر جائزہ

مصطفیٰ عباس* ڈاکٹر ثمرہ ضمیر**

Brief review of Iqbal's services in promoting Urdu

Mustafa Abbas/ Dr. Samra zamir

The Urdu language was formed from the capital words of many languages. If we look at the origin and evolution of Urdu language in India into different periods, then the journey that started in the first period went through different stages. From Allama Iqbal, the sixth period of development and evolution of Urdu begins.

Allama Iqbal being a supporter of purposeful literature, resorted to both poetry and prose to convey the universal message to the world of nation. This led to a significant increase in the academic, literary, and stylistic capital of the Urdu language.

Before Allama Iqbal, the status of Urdu poetry was limited only to entertainment. Iqbal took it from earth to heaven due to observation, experiences, sincerity, and high thinking. Allama Iqbal gave new meaning to analogies and metaphors. This article is about the brief review of Iqbal's services in promoting Urdu.

* پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد ** وفاقی اردو یونیورسٹی، کراچی

علامہ اقبال ایک عظیم شاعر ہونے کے ساتھ باکمال مفکر بھی تھے۔اس لیے انھوں نے مقصدی ادب کو زیادہ فروغ دیا۔ان کے دل میں قومی ہمدردی زیادہ تھی اس لے اپنا پیغام قوم وملت تک پہنچانے کے لیے شاعری کی زبان کو منتخب کیا۔شروع شروع میں اقبال نے داغ دہلوی کے رنگ مین غزلیں کہی۔لیکن یہ محدود مدت کے لیے تھا۔بہت جلد اقبال نے اپنے لیے جداگانہ راہ اختیار کیا۔اپنے پیش روشعراء میں اقبالؔ اسداللہ خان غالبؔ سے سب سے متاثر نظر آتے ہیں۔خالد اقبال یاسرؔ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"اردو شاعری میں اقبال جس سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے وہ غالبؔ ہے۔غالب اردو میں اپنی نوعیت کا پہلا شاعر ہے جس نے گہرے فلسفیانہ مضامین کو شاعری کے قالب میں ڈھالا۔اس لیے جب اقبال نے شاعری میں فلسفیانہ مضامین سمونے کی کوشش کی تو ان کی نظر بلاارادہ غالبؔ پر پڑی" (۱)

غالبؔ کے بعد اقبال ہی وہ واحد شاعر ہے جس نے لفظ کو نئے معنی ومفہوم کی روشنی سے مالا مال کیا۔مولانا الطاف حسین حالیؔ کے دل میں قوم کے لیے درد تھا۔دل چھپے اسی درد کی بنیاد پر مولانا حالیؔ مسلمان قوم کو جگانا چاہتے تھے۔اس لیے ان کی شاعری قومی وملی شاعری پر مشتمل ہے۔اقبال حالیؔ کے اس طرز بیان سے بھی متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔لہذا اپنی شاعری میں قومی درد اور جذبے کو رواں انداز میں دل کی گہرائیوں سے بیان کرنے کے لیے انھوں نے حالیؔ سے کسب فیض کیا۔اسی طرح اکبر الہ آبادی قوم کی اصلاح چاہتے تھے۔اس لیے انھوں نے مغربی تہذیب کی یلغار کو روکنے کی کوشش کی۔یوں اقبال ان کے انداز رِوش سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔

تحریک علی گڑھ نے ایک سطح پر قومی تحریک پیدا کر دی تھی۔چنانچہ سرسید نے مغربی علوم وتہذیب کو روکنے کی بجائے مسلمانوں کی ترقی کا سبب جان کر اس کے چلنے کی خاص تلقین کی۔جس کی وجہ مقصدی ادب تخلیق کیے جانے لگا۔یوں ادب برائے ادب کی بجائے ادب برائے زندگی کا نظریہ واضح ہوا۔لیکن بہت جلد اس تحریک کے خلاف رومانوی تحریک شروع ہوگئی۔لہذا اس تحریک کے زیر اثر ابتدائی طور پر میر ناصر علی، آزادؔ اور عبدالحلیم شرر نے منفرد ادب تخلیق کیا۔ڈاکٹر انور سدید اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"جذباتی سطح پر اس ردعمل کو مثبت صورت میں محمد حسین آزادؔ، میر ناصر علی، اور عبدالحلیم شرر نے ابھارا، اور ان اسالیب کو فروغ دینے کی کوشش کی۔جن میں ادیب کا تخیل جذبے کی جوئے تیز رو کے ساتھ چلتا ہے اور قلم کے وجدان سے ان سے رہنمائی حاصل کرتا ہے" (۲)

۱۹۰۱ء میں مخزن کی اجراء کے بعد رومانوی تحریک کا ردعمل اور بھی واضح ہوگیا۔ یوں رومانوی فکر کے حامل شعراء کو ایک پلیٹ فارم میسر ہوا اور انھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے رومانوی تحریک کو بڑھاوا دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس تحریک سے اقبال خود بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ چناچہ علامہ نے رومانوی فکر کے زیر اثر ماضی کی عظمتوں کو اجاگر کر کے قوم کی حال سمجھانے کی جا بجا کوشش کی ہے۔ ان کی اکثر نظموں میں رومانیت جا بجا نظر آتا ہے۔

اردو زبان کئی زبانوں کے سرمایہ الفاظ سے تشکیل پائی تھی۔ اگر ہندوستان میں اردو زبان کے آغاز و ارتقاء کو مختلف ادوار میں تقسیم کر کے دیکھیں تو پہلے دور میں شروع ہونے والا سفر مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے چھٹے دور میں اقبال اور ان کے ہم عصرین تک پہنچ جاتا ہے۔

علامہ اقبال سے اردو کے فروغ و ارتقا کا چھٹا دور شروع ہوتا ہے۔ علامہ مقصدی ادب کے حامی ہونے کی وجہ سے، عالم گیر پیغام کو قوم و ملت تک پہنچانے کے لیے نظم و نثر دونوں کا سہارا لیا۔ جس سے اردو زبان کے علمی، ادبی اور اسلوب کے سرمائے میں ایک اہم اضافہ ہوا۔ علامہ اقبال چونکہ فطری طور پر شاعر تھا۔ اس لیے ان کی اردو شاعری سے اردو زبان و ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ علامہ سے پہلے اردو شاعری کی حیثیت صرف تفریح طبع تک محدود تھی۔ اقبال نے مشاہدات، تجربات، خلوص اور بلند فکری کی بدولت اسے زمین سے آسمان تک پہنچا دیا۔ علامہ اقبال نے تشبیہات و استعارات کو نئے معنی دے کر، نئے ڈھنگ سے استعمال کیا۔ جس سے اردو شاعری میں نئے موضوعات داخل ہو گئے۔ اقبال کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ فلسفیانہ مضامین کو شاعری میں اس طریقے سے برتا کہ انسانی فہم کی گرفت سے بالا تر نہ ہو۔ عبید الرحمن ہاشمی لکھتے ہیں:

"اردو شعری روایت میں اقبال پہلے شاعر ہیں۔ جو کسی سادہ سے لفظ کو ایک پیچیدہ تصور اور گہرے فلسفیانہ معنی کا حامل بنا دیتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان سے قبل اردو شاعری میں الفاظ کا سرمایہ درآمد کیا جاتا تھا۔ اور اس میں شاعر کا مافیہ اور مدعا بھی ہوتا تھا۔ لیکن اقبال کی انفرادیت اور اہمیت یہی ہے کہ انھوں نے ایک سمجھے بوجھے فلسفہ و تصور کو شاعری کی زبان میں اس طرح پیش کیا۔ جسے ہم ان کا لاشعوری تجربہ سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔ جو کسی بھی شاعر کا بیش قیمت عطیہ ہے۔" (۳)

علامہ اقبال کی عظمت و مقام کا راز ہی یہی ہے کہ انھوں نے اظہار خیال کے لیے ایک ایسا سانچہ ایجاد کیا جس کے ذریعے لفظوں کو سوچ سمجھ کر برتا گیا اور نئی معنی و مفاہیم سے آشنا کیا۔ اس ضمن میں علامہ نے عربی اور فارسی شاعری

سے بھی اکتساب فیض حاصل کیا۔ یوں ان زبانوں کی تراکیب کو اردو لباس کا پہناوا پہنا کر پیش کیا جو بعد میں اردو زبان کا حصہ بن گئی۔ اقبال کے اسی فن کے بارے میں گوپی چند نارنگ یوں لکھتے ہیں:

"بڑے شاعر ایک طرف تو پرانے لفظوں کو فکر کی توانائی اور زور بیان سے نیا رخ دیتے ہیں۔ اور دوسری طرف وہ اظہار مطالب کے نئے سانچے بناتے ہیں۔ نئے الفاظ بنانا ممکن اور مناسب نہیں ہوتا۔ اس لیے بڑا شاعر اپنی زبان کے دوسرے لسانی سرچشموں سے بہت سے ایسے الفاظ حاصل کرتا ہے جو اس سے پہلے اس کی زبان میں رائج نہیں ہوتے تھے۔ وہ بعض مروجہ الفاظ کو نئے مفہوم میں استعمال کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بڑے پیمانے پر اعلیٰ تخلیقی عمل بھی کرتا ہے" (۴)

علامہ اقبال کے ابتدائی دور کی شاعری میں ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے بچوں کے لیے کئی نظمیں لکھیں۔ یہ نظمیں انہوں نے خاص طور پر انگریزی زبان سے بچوں کے لیے ترجمہ کیا تھا۔ اقبال نے اپنے اس عمل کے ذریعے اردو زبان و ادب کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

اقبال جب اعلیٰ تعلیم کے واسطے جب یورپ گئے تو سفر یورپ کے دوران پیش آنے والے واقعات، تجربات اور مشاہدات سے ان کا فکری رجحان قومیت کی طرف ہوا۔ یوں اقبال کی فکر کا مرکز ملت بیضا ٹھہری۔ وہ دن رات اسی فکر میں غلطاں رہتے تھے کہ کس طرح ملت اسلامیہ کو تباہی و بربادی کے گڑھے سے نکالا جایے۔ اب اقبال کے لیے شاعری ایک ایسا ہتھیار بن گئی جس کے سہارے انھیں مسلمانان ہند اور عالم اسلام کی فکری رہنمائی لینا تھا۔

اقبال کی شاعری میں بنیادی اہمیت فلسفہ خودی کو حاصل ہے۔ اقبال سے پہلے خودی کو تکبر اور غرور کے معنوں میں لیا جاتا رہا لیکن اقبال نے اپنی شاعری میں لفظ خودی کی نئے انداز میں تفہیم کر کے اردو ادب کے باب میں ایک اہم اضافہ کیا۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم فکر اقبال میں خودی کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

"خودی کی ماہیت کو جاننا عرفان نفس بھی ہے اور عرفان رب بھی۔ اور اس عرفان رب میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ زور خودی سے حیات عالم وابستہ ہے اور ہر انفرادی نفس کی استواری اس کی زندگی کی ضامن ہے۔ جو قطرہ شبنم بنتا ہے وہ چند لمحوں میں خودی کے ضعف کی وجہ سے نابود ہو جاتا ہے۔ جو قطرہ اشک بنتا ہے۔ وہ ٹپک کر ناپید ہو جاتا ہے۔ لیکن جو قطرہ صدف نشین ہو کر اپنی خودی کو مستحکم کر لیتا ہے وہ گوہر بن جاتا ہے۔" (۵)

فلسفہ خودی کے علاوہ اقبال نے اپنی شاعری میں اور بھی تصورات پیش کیے۔ جن سے اردو ادب کا دامن اور

بھی وسیع ہوا۔ان تصورات میں اشتراکیت،ملوکیت،جمہوریت،مغربی تہذیب،عورت،تعلیم،سرمایہ داری وغیرہ اہم ہیں۔علامہ اقبال نے شاعری کے علاوہ اقتصادیات سے خصوصی دلچسپی ہونے کی وجہ سے ایک نثری کتاب علم الا قتصاد لکھی۔جس سے اردو کے نثری صنف کے باب میں ایک اور اہم اضافہ ہوا۔

اقبال نے اردو شاعری میں پہلی بار مغربی جمہوریت کی بجائے اسلام کے نظام کو حقیقی جمہوریت کی اساس جانا۔وہ مغرب کے نکتہ چیں ضرور ہیں لیکن انھوں نے مغربی تہذیبوں کی خوبیوں کو بیان کرنے کے ساتھ مشرقی خامیوں کو بھی اپنی نظروں سے اوجھل ہونے نہیں دیا۔اسی طرح اقبال کے نزدیک تعلیم مادی اور روحانی دونوں معاملات کے لے ضروری ہے۔تعلیم کی بدولت انسان احترام آدمیت سیکھتا ہے۔اقبال مغربی طرز تعلیم کے مخالف تھے۔ان کے نزدیک مغربی طرز تعلیم انسان کو اپنی روایات سے دور کر دیتی ہے۔اقبال اپنے قوم کے نوجوانوں کے لیے ایسی تعلیم چاہتے ہیں۔جوان کی روحانی تربیت کرنے کے ساتھ اپنی خودی کو بھی پہچان سکے۔

علامہ اقبال نے جہاں اپنی شاعری میں مسلم شخصیات کا ذکر کیا ہے وہاں اقبال نے ان غیر مسلم شخصیات کا بھی ادب کے ساتھ تذکرہ کیا ہے۔جو اپنے کارناموں کی بدولت تاریخ کے صفحات کو روشن کرتے ہیں۔انسانیت سے محبت کے باعث اقبال ان کو بھی خراج عقیدت پیش کیا۔

متذکرہ بالا موضوعات کے علاوہ بھی اقبال نے بہت کچھ لکھا۔اقبال سے پہلے اردو شاعری میں ایسے موضوعات پہلے ناپید تھے۔اگرچہ کچھ پرانے موضوعات کو اقبال نے شاعری کا حصہ بنایا لیکن بالکل نئے معنی ومفہوم کے ساتھ پیش کیا۔اردو شاعری میں ان موضوعات کے دخول سے اردو زبان میں مزید وسعت پیدا ہوئی۔

اقبال نے شاعری میں لفظ اور معنی کے رشتے کو گہرائی کے ساتھ دیکھا تھا۔لفظ اور خیال کے درمیان مطابقت پیدا کرنا اور خیال کو لفظوں کے سہارے بیان کرنا کوئی آسان کام نہیں۔سید عابد علی عابد شعر اقبال میں لکھتے ہیں:

"الفاظ ومعنی میں مطابقت پیدا کرنے کے لیے دل بیدار اور چشم بینا کی ضرورت ہوتی ہے۔اقبال کی نگاہ ایسی دور رس ہے کہ گویا لفظ کے سینے میں اتر جاتی ہے اور اس کے تمام امکانات ٹٹول لیتی ہے۔پھر جب وہ اپنے مطلب کو اپنے منتخب الفاظ میں ادا کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ گویا اس مطلب کے لیے یہی الفاظ وضع کیے گئے تھے" (۶)

علامہ اقبال چونکہ ایک فلسفی شاعر تھے۔اس لیے انھوں نے لفظ ومعنی کے رشتے کو فلسفیانہ انداز سے دیکھا۔اس ضمن میں سید جابر علی یوں لکھتے ہیں:

"فلسفی اقبال نے لفظ و معنی کے رشتے کی نوعیت پر فلسفیانہ میلٹھڈ سے نظر ڈالی اور ان دونوں نے وہ رشتہ قائم کیا جو اس کا صحیح اور حکیمانہ پہلو نمایاں کرتا ہے" (۷)

اقبال نے اپنی شاعری میں لفظوں کو بڑی خوبصورتی سے برتا ہے۔ان کے اشعار میں لفظوں کے آہنگ سے موسیقیت پیدا ہوتی ہے۔لفظوں کے چناو میں انھیں مہارت حاصل ہے۔وہ لفظوں کے صوت و آہنگ سے بھی آشنا ہے۔

فروغ اردو کے سلسلے میں اقبال کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے پرانے لفظوں کو نئے طریقے سے ان میں جدت پیدا کر کے استعمال کیا۔اقبال سے پہلے اردو شعری روایت میں بلبل کو عاشق سمجھا جاتا تھا۔اقبال نے لفظ بلبل کو ایک نئی معنویت سے آشنا کیا۔اسی طرح لفظ پروانے کو اردو شعری روایت سے ہٹ کر قوم کی علامت بنا دیا۔اقبال نے ساقی کی علامت کو شاعر،جگنو کو رہبر ،لالہ کو مسلم امہ اور شاہین کو مرد مومن سے تشبیہ دیا۔

اقبال سے پہلے کی اردو شعری روایت اور اسلوب، اقبال کی اسلوب بیان کے لیے ناکافی تھی۔لہذا انھوں نے فارسی روز مرہ محاورات کا بے دریغ استعمال کیا۔عربی فارسی تراکیب کو بھی اردو زبان کے قالب میں ڈھالا۔انھوں نے کچھ تو نئی تراکیب وضع کیں اور کچھ پرانی تراکیب کو نئے انداز میں پیش کیا۔اور کچھ دوسری زبانوں کی تراکیب کا بھی ترجمہ پیش کیا۔علامہ اقبال نے جب اردو شاعری میں تلمیحات کا استعمال کیا تو پرانی شعری روایت سے ہٹ کر نئے معنی و مفاہیم کے ساتھ پیش کیا۔آتش نمرود،خلیل و نمرود،کلیم و فرعون،عصائے کلیم،ضرب کلیم،موسیٰ و فرعون جیسے تلمیحات کا استعمال کر کے اردو ادب کے شعری کائنات میں بے پناہ اضافہ کیا۔اقبال نے تلمیحات کے سہارے اسلاف کے کارناموں کو موثر پیرایے میں بیان کیا۔اقبال نے شاعری میں تلمیحات کا بے دریغ استعمال کر کے اس بات کا ثبوت دیا کہ ان کا رشتہ ماضی کی روایات سے جڑی ہے۔

اگر چہ اقبال نے غزلیں کم اور نظمیں زیادہ کہیں۔لیکن ان کی غزلوں میں تغزل کی ایک انتہا پایا جاتا ہے۔ اقبال کی غزلیں اور نظمیں مریضانہ افسردگی پیدا کرنے کی بجائے جوش اور ولولہ پیدا کرتی ہے۔علامہ اقبال نے غزل کے تقاضوں کو بدل ڈالا اور اسے نیا لب و لہجہ عطا کیا۔جس سے اردو غزل کی روایت میں فکر کی بلندی اور لسانی پھیلاو آیا۔بقول اسلم انصاری: " اقبال نے اردو غزل کو لہجے کی تازگی،فکر کی بلندی،جذبے کی سچائی،اور خارجی کائنات سے ایک نئی نسبت عطا کی" (۸) اقبال کے نئے انداز بیان اور طرز اظہار سے اردو زبان میں مزید وسعت پیدا ہوئی۔انیس ناگی کے خیال میں:

"اقبال نے غزل میں ہر لہجے، ہر رنگ اور ہر زبان کے الفاظ کو استعمال کر کے غزل کی لسانی حرمتوں کو یکسر بدل ڈالا۔ جو لفظ غیر شاعرانہ ثقیل اور غیر فصیح سمجھے جاتے تھے وہ فصیح خوش آہنگ اور شاعرانہ بن گئے" (۹)

علامہ اقبال کو اشعار لکھتے وقت قافیہ ردیف اور بحور عروض پر ملکہ حاصل تھا۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ایسی بحروں کا استعمال کیا جن سے کلام میں روانی، موسیقیت اور ترنم پیدا ہو۔ اقبال نے اپنے انداز بیان اور طرز اظہار میں تشبیہ، استعارہ، کنایہ، مجاز مرسل تمثیل اور تلمیح سے کام لیا۔ یوں صنائع بدائع اور تلمیحات کے استعمال سے اردو زبان کی نہ صرف دامن کو وسیع کیا بلکہ ارتقائی مراحل کے اگلی منازل سے بھی آشنا کیا۔

اقبال کی شاعری کے موضوعات عظیم، اسلوب نہایت شائستہ اور الفاظ و معنی میں گہرا رشتہ اور مطابقت ہے۔ ان تمام باتوں کے پیچھے ان کا گہرا فلسفہ، وسیع مشاہدہ و مطالعہ اور انسانیت سے محبت اور لسانیات پر عبور جیسے محرکات ہیں۔ ڈاکٹر محمد ریاض "اقبال اور احترام انسانیت" میں یوں رقمطراز ہیں:

"مجموعی طور پر اردو شاعری کے حوالے سے اقبال کے بارے میں ہم کہیں گے کہ وہ جتنے جلد بلند مرتبہ غزل کے شاعر ہیں۔ اتنے ہی یا اس سے زیادہ بھی کچھ بڑے نظم کے شاعر ہیں۔ جو مضامین اقبال کی غزلوں اور نظموں میں ملتے ان میں بیشتر وہ ہیں جن سے اردو شاعری کا دامن تہی تھا۔ ان کی غزل کے چند مضامین غالب کے ہاں ملتے ہیں۔ اردو نظموں کے بعض مضامین اقبال کے بزرگ اور پیش رو معاصرین کی نظموں میں تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ اس کے باوجود اقبال کے فکر و فلسفے کی طرح ان کی اردو شاعری کا لب و لہجہ اور اسلوب بیان نادر اور نیا ہے۔" (۱۰)

اقبال کو لسانی شعور تھا اس لیے وہ شاعری کے ساتھ اردو نثر لکھنے میں بھی کامیاب رہا۔ نہ صرف یہی بلکہ انھوں نے لسانیات، فلسفہ، اور مذہب جیسے موضوعات پر مضامین لکھے۔ یہ مضامین مخزن میں باقاعدگی کے ساتھ چھپتے رہے۔ اقبال کی مادری زبان پنجابی تھا۔ وہ اہل زبان نہیں تھا۔ مگر پھر بھی اقبال اردو سے محبت کی بنیاد پر اردو میں لکھنا باعث فخر سمجھتا تھا۔ اہل زبان نہ ہونے کی وجہ سے اقبال پر تنقید بھی ہوئے۔ اقبال نے ان اعتراضات کے جواب میں ایک مضمون اردو زبان پنجاب میں لکھا۔ یہ مضمون ایک طرف سے تو معترضین کے لیے جواب تھا لیکن دوسری طرف اردو زبان کے متعلق معلومات بہم پہنچاتا ہے۔ ایڈیٹر "تنقید ہمدرد" کے بارے میں اقبال لکھتے ہیں:

"ہمارے دوست تنقید ہمدرد اس بات پر مصر ہیں۔ کہ پنجاب میں غلط اردو کے مروجہ ہونے سے بہتر ہے کہ اس صوبے میں اس زبان کا رواج ہی نہ ہو۔ لیکن نہیں بتاتے کہ غلط اور صحیح کا معیار کیا ہے۔ جو زبان ابھی بن رہی ہو اور

جس کے محاورات والفاظ جدید ضروریات کو پورا کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً اختراع کیے جارہے ہوں اس کے محاورات وغیرہ کی صحت وعدم صحت کا معیار قائم کرنا میری رائے میں محالات سے ہے۔" (۱۱)

علامہ نے اردو شاعری کے ساتھ نثری میدان، میں بھی اردو زبان کی خدمت کی۔علامہ کا اسلوب نثر علمی نوعیت کا زیادہ ہے۔ان کے اعجازِ قلم سے کئی علمی نثری سرمائے وجود میں آئے۔اقبال نے اپنے اسلوب بیان کا جوہر اپنے اردو خطوط میں دکھائے ہیں۔خطوط اقبال سے ہی ان کا نثری اسلوب متعین ہوتا ہے۔خطوط اقبال کے ذریعے ان کے شخصیت کے خال وخط واضح ہوتے ہیں۔اسی لیے اقبال کے خطوط اردو زبان کا سرمایہ ہیں۔علامہ کے خطوط سے ان کی زبانی دانی اور اردو زبان سے ان کی محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔

مختصراً اقبال کی اردو زبان کی توسیع کے لیے کی گئی کاوشوں سے اردو زبان اس قابل ہوسکی کہ دہلی جامع مسجد کی سیڑھیوں تک محدود رہنے والی زبان میں اتنی توانائی آگئی کہ ہر طرح کے علمی، ادبی، سائنسی، فلسفیانہ، تاریخی اور نفسیاتی مضامین کو اردو زبان کے سہارے بیان کرسکنے کے قابل ہوا۔نہ صرف یہی بلکہ علامہ اقبال نے زبان کے سارے اسالیب اور شعبوں کو متاثر کیا۔نئے نئے الفاظ اردو زبان میں لے آئے۔پرانے لفظوں کو نئے معنی ومفہوم عطا کیے۔تشبیہات وتلمیحات میں اضافہ کیا۔قافیہ ردیف عروض، بحور اور صنائع بدائع سے کلام کی زیب وزینت میں اضافہ کیا۔شاعری کے موضوعات ایسے اپنائے جو پہلے اردو کے شعری روایت میں نہ تھے۔عربی فارسی زبان کے تراکیب کو اردو زبان کے قالب میں ڈھالا۔غرض علامہ اقبال نے اردو نظم ونثر دونوں میں اپنی تخلیقات کے ذریعے اردو زبان کو فروغ دیا۔

متذکرہ بالا بحث ومباحثے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو زبان کی فروغ کے لیے اقبال کی کاوشیں ناقابل فراموش ہیں۔انہی کوششوں اور کاوشوں کی وجہ سے اردو زبان اس قابل ہوسکی کہ اس میں ہر طرح کے علمی ادبی، سائنسی، فلسفیانہ، تاریخی اور نفسیاتی مضامین کو ادا کرسکے۔

حوالہ جات

۱۔خالد اقبال یاسر، اقبال اور معاصر ادبی تحریکیں، اکادمی پاکستان لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۶۵

۲۔انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، مقالہ پنجاب یونیورسٹی ، ۱۹۷۳ء، ص ۴۸۳ / ۴۸۴

۳۔قاضی عبید الرحمن، شعریات اقبال، سفینہ ادب لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۱۳۹

۴۔گوپی چند نارنگ، اقبال کا فن، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۸۳ء، ص ۸۰ / ۸۱

۵۔خلیفہ عبد الحکیم، ڈاکٹر، فکر اقبال، بزم اقبال کلب روڈ لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۴۶۳ / ۴۶۴

۶۔سید عابد علی عابد، شعر اقبال، بزم اقبال لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۲۷۳

۷۔جابر علی، اقبال کا فنی ارتقا، بزم اقبال لاہور، ۱۹۷۸ء، ص ۱۳۱

۸۔اسلم انصاری، اقبال عہد آفریں، کاروان ادب ملتان، ۱۹۸۶ء، ص ۲۰

۹۔انیس ناگی، تنقید شعر، مکتبہ میری لائبریری لاہور، ۱۹۶۸ء ص ۴۷

۱۰۔محمد ریاض، اقبال اور احترام انسانیت، ندر پبلیشرز لاہور، س ن، ص ۱۵۴

۱۱۔محمد اقبال، ڈاکٹر، مقالات اقبال (مرتبہ) سید عبد الواحد معینی، شیخ اشرف تاجر کتب، کشمیری بازار لاہور، ص ۲۰

***

اقبال کی نظم "مسجد قرطبہ" کا عروضی مطالعہ

*ضیاء الرحمان **جویریہ خان

Prosodic study of Iqbal's poem"Masjid Cordoba".

Zia ur Rahman/Javeria Khan

It is only once in centuries that the perspicacious poets like Allama Iqbal are born. Not only his poetry functions as soothing for feelings and emotions but it also has a universal message."Masjid e Qurtuba)"The Masjid of Cordova(is a long and famous poem of Iqbal, much more is written about the technical and ideological aspects of this poem, here only the metrical composition(Urooz ka mutalea(of this poem is under consideration.

The rhythm of this poem is"Munsarih" and the meter is"Musamman Mutawwi Mutawwi Maksoof/ Mauqoof".It is a compound meter which is composed from the repetition of two constituents"Mustaf'alan and Maf'oolaat", in Urdu poetry neither this"Bahr Musamman" nor"Musaddas Salim" is in use, however the poets of Urdu language have practised on its various variants but this meter is scarcely used as compared to other"Murakkab Bahoor".In this poem the poet has created diversity and musical aspect by combining other variants with primary rhythm

مقالے کا موضوع :اس مقالے کا موضوع "اقبال کی نظم مسجد قرطبہ کا عروضی مطالعہ" ہے، پہلے حصہ میں نظم کی بحر اور بنیادی وزن کو موضوع بنایا گیا ہے اور دوسرے حصہ میں نظم کے چند اشعار کی تقطیع کرائی گئی ہے۔

طریقہ کار :سب سے پہلے نظم کی بحر "بحر منسرح" کا بغور مطالعہ کیا گیا اور عروض پر لکھی گئی کتابوں کی روشنی میں اردو شاعری میں اس بحر کے مروجہ اوزان کی نشاندہی کرائی گئی اور پھر مسجد قرطبہ کے اشعار سے مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

ڈاکٹر اقبال جیسے دیدہ ور شاعر صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں، ان کی شاعری محض تسکین ذات کا وسیلہ اظہار نہیں بلکہ ایک آفاقی پیغام رکھتی ہے یہی وجہ ہے کہ اردو ادب میں" اقبالیات" ایک الگ شعبہ کی مانند ہے اور آئے دن قارئین اِقبال اس میں نئے گوشے تلاش اور تراش کر کے اس میں اضافہ کر رہے ہیں بنیادی طور سے اقبال نظم کے شاعر تھے وہ شاعری کے ذریعے دنیا کو ایک پیغام دینا چاہتے تھے جس کے لیے دیگر اصنافِ سخن کے مقابلہ میں نظم زیادہ موزوں تھی اس لیے اقبال نے نظم کو وسیلہء اظہار ٹھہرایا لیکن اس کے ساتھ ساتھ دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے بالخصوص اردو غزل کا باب اقبال کا تذکرہ کیے بغیر نامکمل سمجھا جاتا ہے۔

اقبال کی طویل نظموں میں ایک نظم" مسجد قرطبہ" ہے، اس نظم کے پس منظر مختلف پہلو اور فن فکر پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اس مختصر مضمون میں اس نظم کا صرف عروضی مطالعہ زیرِ غور ہے، کہ نظم کے بنیادی بحر میں مختلف ارکان پر مختلف زحافات کا استعمال کر کے خلطِ اوزان سے کلام میں کس قدر رنگارنگی پیدا کی گئی ہے۔

اس نظم کے فنی پہلو پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب لکھتے ہیں۔

''مسجد قرطبہ، ترکیب بند ہیئت کے آٹھ بندوں پر مشتمل ہے، بحر کا نام منسرح مثمن مطوی موقوف مکسوف ہے، اس کا وزن اور ارکان یہ ہیں۔

مستفعلن فاعلن مستفعلن فاعلات"۔(۱)۔

مسجد قرطبہ کے اشعار عروضی تناظر میں دیکھنے سے پہلے اس بحر کے سالم اور زحاف اوزان نیز اردو شاعری میں اس بحر کی مستعمل زحاف صورتیں اساتذہء عروض کی روشنی میں پیش کی جاتی ہے تاکہ دورانِ تقطیع سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔

بحر منسرح : یہ مرکب بحر دو ارکان کی تکرار سے بنی ہے، مستفعلن مفعولاتُ مستفعلن مفعولاتُ، سالم بحر میں آخری حرف متحرک ہے اور اردو میں ایسے الفاظ بہت کم ہیں بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں اس لیے یہ بحر اردو شاعری میں سالم مستعمل نہیں البتہ اس بحر کے زحاف اوزان میں شاعری ملتی ہے لیکن وہ بھی نسبتاً کم، ایک شاعر صرف قادر الکلامی ظاہر کرنے کے لیے اس بحر میں کلام نظم کرتا ہے کیونکہ یہ بحر اردو میں کثیر الاستعمال بحور میں سے نہیں بلکہ شعراء نے بہت کم اس طرف توجہ دی ہے اگرچہ اس بحر کے زحاف اوزان بہت خوش آہنگ ہیں لیکن پھر بھی شعراء نے بہت کم توجہ دی اور اگر کسی شاعر نے اس بحر میں طبع آزمائی کی بھی ہے تو صرف ایک دو غزلوں تک دیگر مرکب بحور کی طرح نہیں البتہ ڈاکٹر اقبال کے ہاں اس بحر کے مختلف اوزان میں اشعار ملتے ہیں جو اس کی قادر الکلامی اور عروض شناسی کا بین ثبوت ہے،

اقبال کے علاوہ غالب، قتیل شفائی، غلام محمد قاصر اور بعض دیگر شعراء نے بھی اس بحر میں کلام نظم کیا ہے۔

اس بحر کے بنیادی ارکان مستفعلن اور مفعولات ہے، چونکہ اردو شاعری میں یہ بحر مثمن اور نہ مسدس سالم مستعمل ہے اس لیے زحاف اوزان لکھنے سے پہلے ان دو ارکان کے ان زحافات کا ذکر کیا جاتا ہے جو عروض کی کتابوں میں ذکر ہیں ۔

صاحب بحر الفصاحت کے مطابق رکن "مستفعلن" کے نو زحاف ہیں جو درج ذیل ہیں۔

خبن، طے، قطع، خبل، خلع، رفع، حذذ، اذالہ، ترفیل۔

نمبر شمار	سالم رکن	زحاف	تبدیلی جو واقع ہوئی	حروف جو کم یا زیادہ ہوئے	مزاحف	مزاحف کا نام
۱	مستفعلن	خبن	رکن میں پہلے سبب خفیف کا ساکن گرانا	"مس" سے "س" حذف ہو تو متفعلن بچا	مفاعلن	مخبون
۲	مستفعلن	طے	دوسرے سبب خفیف کا ساکن گرانا	مستف، سے "ف" گرایا تو مستعلن بچا	متفعلن	مطوی
۳	مستفعلن	قطع	وتد مجموع کا ساکن گرنا اور ما قبل ساکن کرنا	علن میں سے ن گرانا اور ل ساکن کرنا	مفعولن	مقطوع
۴	مستفعلن	خبل	اجتماع خبن و طے	خبن سے مفاعلن اور طے سے متعلن بچا	فعلتن	مخبول
۵	مستفعلن	خلع	اجتماع خبن و قطع	خبن سے مفاعلن اور قطع سے مفاعل بچا	فعولن	مخلع
۶	مستفعلن	رفع	رکن سالم سے پہلا سبب ساقط کرنا	مستفعلن سے "مس" ساقط ہو تو تفعلن بچا	فاعلن	مرفوع
۷	مستفعلن	حذذ	اسقاط وتد مجموع	مستفعلن سے "علن" حذف ہوا	فعلن	محذوذ
۸	مستفعلن	اذالہ	وتد مجموع میں ساکن سے پہلے الف بڑھانا	رکن میں ن سے پہلے الف بڑھانا	مستفعلا ن	مذال
۹	مستفعلن	ترفیل	رکن کے آخر میں ایک سبب بڑھانا	سالم رکن کے بعد تن کا اضافہ کرانا	مستفعلا تن	مرفل

رکن مفعولاتُ کے زحاف بحرالفصاحت کے مطابق نو ہیں جو درج ذیل ہیں۔
وقف، طے، خبن، خبل، کسف، رفع، صلم، جدع، نحر۔

نمبر شمار	سالم رکن	زحاف	تبدیلی جو واقع ہوئی	حروف جو کم یا زیادہ ہوتے	مزاحف	مزاحف کا نام
۱	مفعولاتُ	وقف	رکن سالم کا آخری حرف ساکن کرانا	مفعولاتُ کا آخری حرف ساکن ہوا	مفعولان	موقوف
۲	مفعولاتُ	طے	دوسرے سبب خفیف کا ساکن گرنا	"مفعو" کا 'و' گرانا تو مفعِ لات بچا	فاعلاتُ	مطوی
۳	مفعولاتُ	خبن	پہلے سبب خفیف کا ساکن ساقط کرانا	'مف' کا 'ف' ساقط کرانا تو معولاتُ بچا	مفاعیل	مخبون
۴	مفعولاتُ	خبل	اجتماع خبن و طے	خبن سے معولاتُ اور طے سے معلات ہوگیا	فعِلا تُ	مخبول
۵	مفعولاتُ	کسف	وتد مقرون کا دوسرا متحرک ساکن کرانا	لاتُ میں 'ت' ساقط ہو اتو مفعولا بچا	مفعولن	مکسوف
۶	مفعولاتُ	رفع	رکن کا پہلا سبب ساقط کرانا	مفعولات سے 'مف' ساقط کرانا تو عولات بچا	مفعولُ	مرفوع
۷	مفعولاتُ	صلم	وتد مقرون حذف کرانا	مفعو بچا جو فعلن کے برابر ہے	فعلن	اصلم
۸	مفعولاتُ	جدع	پہلے دو سبب گرانا اور آخر حرف وتد کا ساکن کرانا	لاتُ بچا تو 'ت' ساکن ہوئی	فاع	مجدوع
۹	مفعولاتُ	نحر	اسقاط الف بعد جدع	جدع سے لات بچا اور نحر سے "لت"	فع	منحور

چونکہ یہ مرکب بحر ہے اور اردو شاعری میں مثمن ہی مستعمل ہے اس لیے مختلف اوزان میں جہاں اور جس مقام پر رکن میں کمی بیشی واقع ہوئی ہو وہاں پر اس زحاف کا نام لکھا جائے گا جس کی تفصیل اس جدول میں دیکھی جا سکتی ہے۔

ایک بات کی وضاحت اور بھی ضروری ہے کہ شعر کے دو مصرعے ہوتے ہیں اور ہر مصرعہ کے دو بنیادی حصے ہوتے ہیں اگر شعر مسدس یا مثمن ہو تو پھر تین حصے ہونگے اور ہر حصے کا اپنا نام ہے جس کا خیال میں رکھنا ضروری ہے

پہلے مصرعہ کے پہلے حصہ کو صدر اور دوسرے حصہ کو عروض کہتے ہیں جبکہ مصرعہ ثانی کے پہلے حصہ کو ابتدا اور حصہ ثانی کو ضرب کہتے ہیں اس طرح درمیانی حصہ کو حشو کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، مسدس میں ایک اور مثمن بحر میں دو حشو ہونگے۔

اقبال کے ایک شعر سے اس کی وضاحت ہو جائے گی۔

"ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں "(۲)

اس غزل کی بحر متقارب ہے اور وزن مثمن سالم ہے، فعولن فعولن فعولن فعولن۔

ایک مصرعہ میں چار مرتبہ رکن "فعولن" کی تکرار ہے، پہلا فعولن" صدر" دوسرا، تیسرا "حشو" جبکہ چوتھا فعولن" عروض" ہے، اس طرح مصرع ثانی میں پہلا فعولن" ابتدا" جبکہ دوسرا اور تیسرا "حشو" اور آخری فعولن" ضرب" ہے۔

نظم "مسجد قرطبہ" عروضی مطالعہ :اس نظم کی ہیئت ترکیب بند ہے جو آٹھ بندوں پر مشتمل ہے اور ہر بند میں اشعار کی تعداد یکساں ہے، اس نظم کی بحر منسرح ہے اور بنیادی وزن منسرح مثمن مطوی مکسوف موقوف ہے۔

شعر کے مختلف اجزا کا ذکر پہلے ہو چکا، اب دورانِ تقطیع مختلف ارکان میں جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہو اس کی نشاندہی کرائی جائیگی اور جدول سے اس زحاف کی وضاحت ہو سکتی ہے ۔

نظم کا پہلا بند یہ ہے ۔

"سلسلۂ روز و شب، نقشِ گرِ حادثات	سلسلۂ روز و شب، اصل حیات و ممات
سلسلۂ روز وشب، تارِ حریرِ دو رنگ	جس سے بناتی ہے ذات، اپنی قبائے صفات
سلسلۂ روز و شب، سازِ ازل کی فغاں	جس سے دکھاتی ہے ذات، زیر و بم ممکنات
تجھ کو پرکھتا ہے یہ، مجھ کو پرکھتا ہے یہ	سلسلۂ روز و شب، صَیر فی کائنات
تو ہو اگر کم عیار، میں ہوں اگر کم عیار	موت ہے تیری برات، موت ہے میری برات
تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا	یک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات
آنی و فانی تمام، معجزہ ہائے ہنر	کارِ جہاں بے ثبات، کارِ جہاں بے ثبات
اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا	نقش کہن ہو کہ نو، منزلِ آخر فنا" (۳)

پہلے بند کے یہ آٹھ اشعار ہیں یہ تمام اشعار بحر منسرح کے بنیادی وزن میں ہیں لیکن مختلف جگہوں پر ارکان میں جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں ان کا ذکر ساتھ ساتھ کیا جائے گا جس سے خلطِ اوزان کی وضاحت بھی ہو جائے گی۔

بحر منسرح مرکب بحر ہے جس کے ارکان یہ ہیں، مستفعلن اور مفعولاتُ، پہلا جو رکن ہے اس کا صرف ایک مزاحف استعمال ہوا جو مطوی ہے یعنی رکن پر جب زحاف طے واقع ہو جائے تو اس سے جو مزاحف حاصل ہوتا ہے وہ متفعلن ہے اور تقریباً صرف یہ ایک مزاحف تمام جگہوں پر آیا ہے صدر، ابتدا اور حشو تینوں جگہوں پر یہ رکن متفعلن استعمال ہوا ہے اس لیے اس کا نام بھی آسان ہے اور یاد رکھنے میں کوئی دشواری نہیں، بحر کا دوسرا رکن مفعولاتُ ہے، اس بحر میں اس کے مختلف مزاحف مستعمل ہیں، کبھی حشو میں اور کبھی عروض وضرب میں، اس نظم میں یہ زحاف کبھی مطوی، کبھی مطوی مکسوف اور کبھی مطوی موقوف، استعمال ہوا ہے جبکہ غالب کی ایک غزل میں رکن آخر حصہ عروض میں یہ منحور بھی مستعمل ہے، جس کی تفصیل بعد میں آئے گی اور قتیل شفائی کی ایک غزل میں بھی نحر زحاف کا استعمال ہوا ہے جو کسی کاریگری سے کم نہیں۔

نظم کا پہلا شعر اور وزن یہ ہے۔

سلسلہ روز و شب، نقشِ گرِ حادثات سلسلۂ روز و شب، اصل حیات و ممات

اس شعر کا وزن منسرح مثمن مطوی مطوی مکسوف مطوی موقوف ہے۔

متفعلن فاعلن متفعلن فاعلات متفعلن فاعلن متفعلن فاعلات

مصرعہ اولیٰ کے پہلے اور تیسرے جبکہ مصرعہ ثانی کے پہلے اور تیسرے رکن پر زحاف طے واقع ہوا ہے، اس طرح مصرعہ اولیٰ کا دوسرا رکن مطوی مکسوف اور چوتھا رکن مطوی موقوف ہے اس طرح مصرعہ ثانی میں بھی دوسرا رکن مطوی مکسوف اور رکن آخر مطوی موقوف ہے، تقطیع اس شعر کی لکھی جاتی ہے جبکہ مزاحف کی تفصیل جدول میں دیکھی جا سکتی ہے۔

سلسلہَ ---- روز و شب ----نقشِ گرِ ---- حادثات۔
متفعلن ----فاعلن ------متفعلن ------فاعلات۔

سلسلہَ ----روز و شب ----اصل حیا ----تُ ممات۔
متفعلن -----فاعلن -----متفعلن -----فاعلات۔

اس شعر کے دونوں مصرعوں میں صدر اور حشو ثانی میں ایک زحاف کا استعمال ہوا ہے جو مطوی ہے جبکہ حشو اول اور عروض وضرب میں الگ الگ زحاف کا استعمال ہوا ہے، حشو اول میں رکن سالم "مفعولاتُ" کی جگہ فاعلن آیا ہے

جومطوی مکسوف ہے جبکہ عروض وضرب میں فاعلات/ فاعلان آیا ہے جومطوی موقوف ہے۔

شعرنمبر :2س لسلہ ء روز و شب، تارِ حریرِ دو رنگ جس سے بناتی ہے ذات،اپنی قبائے صفات

شعرنمبر 2اور 3کاوزن ایک ہے ایک شعرکی وضاحت سے دوسرے کی وضاحت ہوجائے گی،اس شعرمیں عروض وضرب کازحاف ایک جیسانہیں،مصرعہ اولی میں رکن آخر رکن عروض فاعلن جبکہ مصرعہ ثانی میں رکن آخرحصہ ضرب فاعلات آیاہے، اس طرح مصرعہ اولیٰ میں حشو اول فاعلن جبکہ مصرعہ ثانی میں حشو اول رکن ثانی فاعلات آیاہے، ان اوزان کا خلط ایک شعر میں نہ صرف جائز ہے بلکہ اس سے شاعرکلام میں تنوع اورترنم پیدا کرتاہے،تقطیع سے ارکان کی وضاحت ہو جائے گی۔

سلسلہ-----روز وشب------تارِحری-------رِدورنگ۔
متفعلن------فاعلن------متفعلن------فاعلن۔

جس سے بنا----تی ہے ذات----- اپنی قبا-----ئے صفات۔
متفعلن-----فاعلات-------متفعلن------فاعلات۔

شعرنمبر :4 تجھ کو پرکھتاہے یہ، مجھ کو پرکھتاہے یہ سلسلۂ روز وشب، صَیرِ فی کائنات

شعرمیں تین جگہوں پر زحاف مطوی مکسوف کا استعمال ہوا ہے جبکہ شعر کے رکن آخرحصہ ضرب میں مطوی موقوف کا استعمال ہوا ہے،اس لیے اس شعرکاوزن پچھلے مذکورہ اشعار سے بدل ہے،تقطیع سے وضاحت ہوجائے گی۔

تقطیع : تجھ کو پرکھ------تاہے یہ-------مجھ کو پرکھ-----تاہے یہ۔
متفعلن----------فاعلن---------متفعلن-------فاعلن

سلسلہء--------روز وشب---------صیرِ فی------کائنات۔
متفعلن-------فاعلن----------متفعلن------فاعلات۔

تین جگہوں پررکن فاعلن آیاہے جبکہ مصرعہ ثانی کے رکن آخرمیں فاعلات آیاہے جومطوی موقوف ہے۔

شعرنمبر :5 تو ہو اگر کم عیار ، میں ہوں اگر کم عیار موت ہے تیری برات،موت ہے میری برات

اس شعرکاوزن پچھلے اشعار سے الگ ہے،چاررکان میں فاعلن کی جگہ فاعلات آیاہے اورکسی جگہ پربھی فاعلن کااستعمال نہیں ہے،تقطیع سے ارکان کی وضاحت ہوجائے گی۔

تقطیع : تو ہو اگر------کم عیار-------میں ہوں اگر--------کم عیار۔

متفعلن -------فاعلات-------متفعلن-------فاعلات۔

موت ہے تے------ری برات-------موت ہے مے----ری برات۔

متفعلن-------فاعلات---------متفعلن--------فاعلات۔

شعرنمبر :6 آنی و فانی تمام، معجزہ ہائے ہنر کارِ جہاں بے ثبات، کارِ جہاں بے ثبات

اس شعر کا وزن بھی پچھلے اشعار سے مختلف ہے، اس شعر میں مصرعہ اولیٰ رکن عروض میں زحاف مطوی مکسوف آیا ہے جو فاعلن ہے باقی تین جگہوں پر یہ زحاف مطوی موقوف ہے یعنی فاعلن کی جگہ فاعلات آیا ہے، وضاحت تقطیع سے ہو جائے گی۔

تقطیع : آنی وفا------نی تمام----معجزہ ہا-------ئے ہنر۔

متفعلن -------فاعلات-------متفعلن-----فاعلن۔

کارِ جہاں------بے ثبات------کارِ جہاں-----بے ثبات۔

متفعلن-------فاعلات------متفعلن-----فاعلات۔

اس شعر میں عروض وضرب میں ایک جیسے زحاف کا استعمال نہیں، عروض میں فاعلن آیا ہے جبکہ ضرب میں فاعلات آیا ہے۔

اس بند کا آخری شعر لکھا جاتا ہے جس میں رکن مفعولاتُ کا صرف ایک زحاف استعمال ہوا ہے یعنی حشو اور عروض وضرب میں رکن مطوی مکسوف یعنی فاعلن ہے، دورانِ تقطیع وضاحت ہو جائے گی۔

اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا نقشِ کہن ہو کہ نو، منزلِ آخر فنا

تقطیع :اولُ آ------خرفنا------باطنُ ظا------ہر فنا۔

متفعلن-------فاعلن-------متفعلن-----فاعلن۔

نقشِ کہن-----ہوکہ نو------منزلِ آ------خرفنا

متفعلن------فاعلن------متفعلن-----فاعلن۔

یہ نظم "مسجد قرطبہ" کا پہلا بند ہے، ان آٹھ اشعار میں سے صرف دو جگہوں پر اشعار کا وزن ایک جیسا ہے باقی اشعار کا وزن ایک دوسرے سے معمولی مختلف ہے یعنی ارکان سارے اشعار میں ایک جیسے نہیں، پہلے شعر میں حشو کے ارکان، فاعلن جبکہ عروض وضرب میں فاعلات آیا ہے، اس طرح شعرنمبر 2 اور 3 میں مصرعہ اولیٰ میں دونوں جگہ

فاعلن آیا ہے جبکہ مصرعہ ثانی میں دونوں جگہوں پر فاعلات آیا ہے،شعرنمبر 4اور 6 میں تین جگہوں پر رکن فاعلن آیا ہے جبکہ صرف مصرعہ ثانی کے رکن آخر حصہ ضرب میں فاعلات ہے،شعر 5 میں چاروں جگہ پر فاعلن کی جگہ فاعلات آیا ہے یعنی حشو،حشو اور عروض وضرب میں رکن فاعلات آیا ہے۔

شعرنمبر 7 میں تین ارکان فاعلن کی جگہ فاعلات آئے ہیں اور صرف ایک جگہ پر فاعلن آیا ہے لیکن دیگر اشعار کے وزن سے اس لیے مختلف ہے کہ عروض میں فاعلن جبکہ ضرب میں فاعلات آیا ہے۔

اس بند کا آخری شعر یعنی 8 نمبر شعر اس طرح ہے۔

اول آخر فنا، باطن و ظاہر فنا نقشِ کہن ہو کہ نو، منزلِ آخر فنا

اس شعر کا وزن دیگر اشعار سے اس لیے مختلف ہے کہ اس میں چاروں ارکان فاعلن آئے ہیں یعنی اس میں کہیں بھی رکن فاعلن کی جگہ فاعلات نہیں آیا ہے۔

یہ تو اس نظم کا پہلا بند تھا،اس نظم کے آٹھ بند ہیں دیگر اشعار میں بھی بنیادی وزن کے ساتھ دیگر اوزان کا خلط ہوا ہے لیکن طوالت سے بچنے کی خاطر اس پر اکتفا ہے۔

غالب کی ایک مشہور غزل ہے جو اس بحر میں ہے لیکن وزن اس سے مختلف ہے،اس کا بھی ذکر کیا جاتا ہے کیونکہ اردو شاعری میں اس بحر کے تقریباً یہی اوزان مروج ہیں جن کا ذکر کیا گیا،اس غزل کی بحر منسرح اور وزن مطوی منحور ہے اور ارکان اس طرح ہیں۔

متفعلن فاعلاتُ متفعلن فع------متفعلن فاعلاتُ متفعلن فع۔

"آکہ مری جان کو قرار نہیں ہے طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے

گریہ نکالے ہے تیری بزم سے مجھ کو ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے" (۴)

تقطیع : آکہ مری-------جان کوقَ-----رار نہیں-------ہے۔

متفعلن----------فاعلاتُ-------متفعلن------فع۔

طاقتِ بے--------دادِ انتِ--------ظار نہیں-----ہے۔

متفعلن---------فاعلاتُ-------متفعلن------فع۔

اس وزن میں مستفعلن کا جو مزاحف ہے متفعلن وہ ہر رکن میں یہی آیا ہے لیکن مفعولاتُ کا مزاحف ایک جگہ

فاعلاتُ ہے جو مطوی ہے اور دوسری جگہ پر فع ہے جو نحر زحاف سے حاصل ہوتا ہے اور منحور کہلاتا ہے۔

قتیل شفائی کی ایک خوبصورت غزل جو بحرِ منسرح کے اس وزن میں ہے درج ذیل ہے۔

"حسن اگر میرا احتساب کرے گا اپنی اداؤں کو بے نقاب کرے گا
دل کو نہ اب منہ لگا قتیل شفائی پھر یہ تری عادتیں خراب کرے گا"(۵)

تقطیع : حسن اگر------میرا احتِ------ساب کرے-----گا۔
متفعلن---------فاعلاتُ--------متفعلن-------فع۔

اپنی ادا-------وَ کو بے نِ--------قاب کرے------گا۔
متفعلن-------فاعلاتُ--------متفعلن---------فع۔

حوالہ جات:

1)اقبال کی طویل نظمیں (فکری اور فنی مطالعہ)، ہاشمی، رفیع الدین، ڈاکٹر، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، 1998، ص 87۔

2)کلیاتِ اقبال محمد اقبال، ڈاکٹر، علامہ، نیشنل بک فاونڈیشن، اسلام آباد، مارچ 2025، ص 389۔

3)ایضاً، ص 419۔

4)دیوانِ غالب، غالب، اسداللہ خان، مرزا، مشتاق بک کارنر، اردو بازار لاہور، س ن، ص 160۔

5)رنگ-خوشبو-روشنی، (کلیات غزل) قتیل شفائی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2017، ص 531۔

***

فلسطین کی موجودہ صورت حال اور مسلم امہ
(کلام اقبال کی روشنی میں)

*بی بی تانیہ

The current situation of Palestine and the Muslim Ummah

(In the light of Iqbal Poetry)

Bibi Tania

The Palestinians have been fighting for their mother land,dignity and survival,they are being brutally butchered by Zionist jews since centuries.On other hand the muslim states,due to their political advantages and interests have been seeing this barbrian attacks silently.Millions of innocent men women and children are being killed by isralies and the muslim scholars have been raising questions over the insensitivity of Muslim leaders and trying to find out the ways to unite the Muslim Nation against this imperialism. Dr Allama Mohammad iqbal is the pioneer an this regard, who have depicted the spiritual death of Muslim nation very clearly and pointed out the reasons behind such slumber and senseless gestures of Muslims.According to him the lack of passion for truth and love for justice and equality are the main reasons behind this prolonged silence.The increasing sectarianism among has crushed their souls.Muslims

* اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، سردار بہادر خان وومن یونیورسٹی، کوئٹہ

has forgotten the massage of prophet and Ehl e bait.In this alarming scenerio Iqbal's lessons;given in his great poetic works can be the only salvation for Muslims to fight against the cruel occupiers, which is the path for trurh against Yazeediyat tought by imam Hussain.

اہل یہود نے عرب کے دل میں ''اسرائیل'' کے نام سے اپنے پنجے گاڑ لیے ہیں۔ان کے عزائم خطرناک اور اعمال ازل سے سیاہ ہیں۔انہیں عرب دیس میں بسانے کے لیے اہل نصاری نے یہ دلیل پیش کی کہ یہودی فلسطین کے قدیم باشندے تھے اس لیے انہیں یہاں پر زندگی گذارنے اور فلسطین کی شہریت ملنے کا پورا حق حاصل ہے۔یہودی دو ہزار سال بعد اپنے بوسیدہ جڑوں کو (جن کا اب نام ونشان بھی نہیں) از سر نو دوام بخشنے کے لیے اگر فلسطین کے حق دار ٹھہرتے ہیں،تو اہل عرب اسپین پر آٹھ سو سال حکومت کرنے کے بعد اس کے حق دار کیوں نہیں ہیں؟ان کے اسلاف کی یادیں بھی تو اندلس کی سرزمین میں کہیں دفن ہیں۔یہ روشن اور زرخیز خیال بھی کلام اقبال ہی کی زینت ہے جو اہل یہود و نصاری کے منہ پر کسی طمانچے سے کم نہیں۔نظم ''شام و فلسطین'' میں فرماتے ہیں:

رندان فرانس کا میخانہ سلامت پر ہے مئے گلرنگ سے ہر شیشہ حلب کا
ہے خاک فلسطین پہ یہودی کا اگر حق ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہل عرب کا
مقصد ہے ملوکیت انگلیس کا کچھ اور قصہ نہیں نارنج کا یا شہد ورطب کا (۱)

یہ سارا قصہ ان سیاسی چال بازیوں کا ہے کہ مسلمانوں کے مراکز میں ہمیشہ کوئی دنگا فساد موجود رہے،اور مسلمان تا حیات ان سیاسی چالوں سے نبرد آزما رہیں۔بہ حیثیت قوم ہمہ وقت وہ کسی نا کسی مسئلے کا شکار رہیں۔ان میں کبھی وہ روح بیدار نا ہو جس کی برکات سے وہ تین براعظموں پر راج کرتے تھے۔

آج کل ہم اکثر مسلمانوں کو خشوع وخضوع کے ساتھ یہ دعا مانگتے ہوئے دیکھتے اور سنتے ہیں کہ اے اللہ فلسطینی مسلمانوں کی مدد کے لیے ابابیل اور فرشتے بھیج۔۔ان دعاؤں اور ترانوں کا پس منظر خصوصاً فلسطین کے سابقہ اور موجودہ حالات اور عمومی طور پر امت مسلمہ کے ناگفتہ باصورت حال سے جڑا ہوا ہے۔۷ اکتوبر ۲۰۲۳ع میں اسرائیل اور فلسطینی تنظیم حماس کے درمیان جس خون ریز جنگ کا آغاز ہوا،اسے تاریخ میں بربریت کی ایک بدترین شکل میں ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔اب بات کو وہیں سے جوڑتے ہیں جہاں سے ابتداء ہوئی تھی۔ایسی کیا بات ہے کہ ہم اپنے مسلمان بھائیوں

کے لیے اللہ سے ابابیلوں اور فرشتوں کی مدد مانگتے ہیں؟ جواب واضح ہے، مسلم امہ کی بے حسی، جو آج اربوں مسلمان عوام الناس کو خون کے آنسو رونے پر مجبور کر رہی ہے۔ ایک طرف بے گور و کفن لاشیں پڑی ہیں، مائیں بہنیں آہ و بکا کر رہی ہیں۔ انٹرنیشنل رپورٹ کے مطابق ہر پندرہ منٹ میں ایک فلسطینی بچہ شہید کیا جا رہا ہے۔ در و دیواروں پر بے کسی، بے بسی، یاسیت اور آزردگی کی کہر جمی ہوئی ہے۔

خوابیدہ مسلم امہ اپنے اسلاف کے کارنامے یاد کر کے آکسیجن حاصل کر رہی ہے ورنہ حالت یہ ہے کہ سانس بھی کفار کی اجازت کے بغیر نہیں لے پاتے۔ مسلمانوں میں غیرت، حمیت، خودی و خوداری نام کی کوئی چیز باقی ہی نہیں رہی۔ ۵۷ اسلامی ممالک کو یہود کا مقابلہ کرنے کے لیے نہ صرف اپنی عسکری قوت پر بھروسہ نہیں بلکہ اپنے جذبہ ایمانی پر بھی ذرہ برابر یقین نہیں رہا۔ مسلم امہ کی بے عملی پر گو کہ مسلم مفکرین نے ہمیشہ افسوس کا اظہار کیا ہے لیکن شاعر مشرق علامہ محمد اقبالؔ کی پر جوش آواز نے ہمیشہ یہ تاثر پیدا کیا کہ اس راکھ میں ابھی چنگاری موجود ہے، جس کے لیے یہ امید پیدا کی جا سکتی ہے کہ بھڑک اٹھے گی۔ ہم ان کی روح کے آگے دست بستہ شرمندہ کھڑے ہیں کہ ابھی تک ایسے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے جس کی بنیاد پر کچھ امید پیدا کی جا سکے۔

اقبالؔ کی آواز شاعری کی صورت میں جب بھی بلند ہوئی اپنے منفرد خیالات کی بناء پر امید و بہم، سوچ و بچار، است و ناہست کے نئے باب کھولتی چلی گئی۔ ان کی انفرادیت کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ جب برصغیر میں اردو شاعری گل و بلبل کے قفس میں قید تھی، تب انہوں نے روایت کی دلالت کے بجائے قارئین کے لیے فکر و تدبر کے نئے در وا کیے۔ ان خیالات کو ڈاکٹر محمود علی شاہ کے ان الفاظ سے تقویت ملتی ہے کہ:

> ''اقبال کی شاعری برصغیر کی روایتی شاعری سے ہٹ کر تھی۔ اس میں نہ تو گل و بلبل کے قصے تھے۔ نہ ہی معشوق کی جدائی میں آہیں اور آنسو تھے۔ نہ یہ غزل تھی جو کہ کسی خوبصورت عورت کی قصیدہ خوانی کرتی۔ بلکہ اس شاعری میں ملک، قوم کی بدحالی کی داستان تھی۔ یہ شاعری نظریاتی تعلیم پر مبنی تھی۔ ان میں ان وجوہات اور حالات کا ذکر تھا جو کہ مسلمانوں کے زوال کا باعث بنے۔ اس میں پدرم سلطان بود کے نظریہ کی مذمت تھی۔ شاندار ماضی کا ذکر تھا لیکن اس حیثیت کے خاتمے کے اسباب کے ذکر کے ساتھ۔''(۲)

بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مسلم امہ کی بے حسی کی جھلکیاں تو حضورؐ کی وصال کے کچھ عرصے کے بعد ہی دیکھنے کو ملیں جب نواسہ رسولؐ کو شہید کیا گیا اور امت تماشا دیکھتی رہی۔ یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے دین

اسلام کی روشنی پھیلانے کے لیے مشرق ومغرب میں فتوحات حاصل کیں۔اس امت نے طارق بن زیاد،قتیبہ بن مسلم اور محمد بن قاسم جیسے جرنیل آٹھویں صدی عیسوی میں بھی دیکھے۔جن کے پایہء استقامت میں کبھی لغزش نہیں آئی۔ مسلمانوں کی ان فتوحات کا نقشہ اقبال نے نظم ''شکوہ'' میں کچھ اس طرح سے کھینچا ہے۔

دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساوں میں کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراوں میں(۳)

نظم ''شکوہ'' میں اقبالؔ نے مسلمانوں کا مقدمہ لڑا۔ان کا دفاع کیا۔مگر وہ صرف مسلمانوں کے وکیل ہی نہیں بلکہ ان کے معالج بھی تھے۔مسلم امہ کی خرابیوں پر ان کی نظر بڑی گہری تھی۔اس لیے ''شکوہ'' کے ڈیڑھ سال بعد انہوں نے نظم ''جواب شکوہ'' لکھی جس میں انہوں نے مسلمانوں کی بے حسی،ضعف الایمانی،زبوں حالی اور شکست وریخت کے وجوہات کی نشاندہی کی ہے۔ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نظم مذکورہ کو مسلمانوں کے دور انحطاط کا مرثیہ کہتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انھوں نے مسلمانوں کی صدیوں کی غلامی اور اس کے زیر اثر پروان چڑھنے والی ذہنی حالت کا کچا چٹھا کھولا ہے اور ایک ہمدرد ڈاکٹر کی طرح اس کا آپریشن کیا ہے۔یہ مسلم دور انحطاط کا مرثیہ ہے۔''(۴)

مذکورہ نظم میں مسلمانوں کے انحطاط کی جو وجوہات انہوں نے بتائی ہیں،اس سے ان کے قلوب میں بے حسی کا در آنا،سینوں پر مہر کا لگ جانا ناگزیر ہے۔حالاں کہ یہ نظم بلقانی ریاستوں،بلغاریہ،سرویا،یونان اور مونٹی نگرو کا باہم متحد ہو کر ترکی پر حملہ کرنے اور سلطنت عثمانیہ کے پس منظر میں لکھی گئی۔مگر اس کا اطلاق دور حاضر میں مسلمانوں کی سنگ دلی پر بھی کیا جاسکتا ہے۔۱۳۔۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان نے مسلمانوں کو دل گرفتہ کیا۔نائن الیون کے بعد افغانی مسلمانوں پر امریکہ کے یلغار نے کلیجہ چیرا،حال میں فلسطینی مسلمانوں کے خون ناحق نے مسلم امت کے حساس طبقے کو دل شکستگی میں گرفتار کیا ہے۔آخر کیا وجہ ہے مسلم امہ فلسطینی بھائیوں کے ساتھ شانہ بہ شانہ لڑنے کے لیے ہمت جٹا نہیں پاتی۔اس بے حسی کی سیاسی وجوہات کو ایک طرف رکھ کر کلام اقبالؔ کی روشنی میں اس کا جائزہ لیں تو بات روز روشن کی طرح عیاں ہے۔سب سے بڑی وجہ مسلمانوں کا مختلف اقوام میں بٹ جانا ہے۔مسلم قومیت کا جو نظریہ اقبالؔ نے پیش کیا،اس کے برعکس مسلمان یورپ کے طرز فکر سے متاثر ہو کر مسلم امت نہیں بلکہ اپنے مخصوص قوم سے جڑے رہنے میں ہی اپنا تحفظ سمجھتی ہے۔شاعر مشرق نے کیا خوب کہا ہے:

شور ہے ہوگئے دنیا سے مسلماں نابود ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود (۵)
وضع میں تم ہو نصاری تو تمدن میں ہنود یہ مسلماں ہیں! جنھیں دیکھ کے شرمائیں یہود

یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو،افغان بھی ہو تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

مختلف قومیتوں میں تقسیم ہوکر مسلمان کمزور پڑ گئے اور یہود و نصاریٰ نے ان کی اس کمزوری کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔

قرآن کریم میں فرقہ وریت کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے اور اقبالؔ نے بھی مفسر قرآن کی حیثیت سے اسے مستحسن نہیں سمجھا۔فلسطین کی تباہ حالی پر بہ جائے تشویش کا اظہار کرنے کے مسلمان نوجوانوں کے اس قسم کے سوال حیران کن ہیں کہ حماس اگر سنی تنظیم ہے تو ایران اس کے لیے آواز کیوں اٹھا رہا ہے؟ حزب اللہ شیعہ تنظیم ہے تو وہ حماس کا ساتھ کیوں دے گا؟ اس کے برعکس یہ سوال اٹھنے چاہیے تھے کہ یہود کون ہوتے ہیں مسلم امہ کا خون بہانے والے؟ یہ تو وہ ہیں جن کے قلعہ خیبر کو ہمارے اجداد نے فتح کیا تھا۔علامہ اقبالؔ کا یہ تصور دم توڑ رہا ہے۔نظم ''خضر راہ'' میں ''دنیائے اسلام'' کے عنوان میں کہتے ہیں کہ:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے نیل کے دریا سے لے کر تا بخاک کاشغر (۶)

فرقہ واریت ایک ایسا زہر ہے جس نے مسلم امہ کا بدن نیلو نیل کر دیا ہے۔آپس کے جھگڑے انہیں متحد ہونے نہیں دیتے۔اس لیے وہ خود کو ایک جان ایک قالب نہیں بلکہ کئی جان اور کئی قالب سمجھتے ہیں۔اس کی وجہ ہمارے معاشرے کے نام نہاد دینی ٹھیکیدار ہیں۔بال جبریل کی نظم ''ملا اور بہشت'' اس ضمن میں اقبالؔ کے خیالات کی بہترین عکاس ہے۔کفار ان کی فرقہ بندی میں ہی اپنی نجات تلاش کرتی ہے۔اسلام دشمن تنظیمیں ان کے بٹے وجود پر خندن ہیں۔یہ لمحہ فکریہ ہے جسے اقبالؔ کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

خندہ زن کفر ہے احساس تجھے ہے کہ نہیں اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں (۷)

آج کے مسلم امہ کی بے حسی کی وجہ یہی ہے کہ وہ حیات اجتماعیہ نہیں بلکہ حیات انفرادیہ کے لیے سرگراں ہیں۔فرقہ واریت نے اسلامی اتحاد کا سبق بھلا دیا ہے لہذا مسلمانوں کے قلوب ایک دوسرے کے لیے بے حس بن گئے ہیں۔بہ قول اقبالؔ

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں (۸)

وطنیت اور قومیت جیسے جراثیم نے عربی اور عجمی کا تصور پیدا کیا۔عربوں کو ترکوں سے دست و گریباں کیا۔فرقہ واریت ہر عہد میں مسلمانوں کے لیے فتنے کا باعث رہا ہے اور اگر یہی حال رہا تو مستقبل بھی خوش آئند نہیں ہوگا۔''طلوع اسلام'' میں کہتے ہیں کہ:

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے تو اے مرغ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا (۹)

مسلم امہ کی بے حسی کی ایک بڑی وجہ تارک القرآن ہونا ہے۔قرآن مجید جو کہ سرچشمہ حیات ہے۔کتاب المبین کے موضوعات ہمیں انسانیت کے ساتھ رحم ومحبت،عدل وانصاف،معاشرتی اونچ نیچ،پڑوسی،والدین،بچوں اور بزرگوں کا احترام سکھاتی ہے۔یہاں تک کہ غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک کا بھی درس دیتی ہے۔قرآن کے موضوعات لا فانی ہیں اور کفار کو اس بات کو خوف ہے کہ اگر مسلمان اپنے دین کی روح کو پہچان گئے تو انہیں اس دھرتی پر کوئی جائے پناہ نہیں ملے گی۔دین کی روح تک پہنچنے کا واحد ذریعہ قرآن پر عمل کرنا ہے۔مسلمان جب قرآن کو اس کی تفسیر وتفاہیم کے ساتھ پڑھنا چھوڑ دیں گے تو بعید نہیں کہ وہ بے حسی کے اس خول میں تا حیات رہیں،جس میں غیر مسلم قید ہیں۔کلام اقبالؒ میں بار ہا قرآن سے دوری کی جانب واضح اظہار ملتا ہے۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر اور تم خواب ہو گئے تارک القرآن ہو کر (۱۰)

آج کا مسلمان قرآن کی قرات کرتا تو ہے مگر اس سے فیض حاصل نہیں کرتا۔ان کے جذبہء ایمانی کو جگانے کے لیے خدا کا کلام ہی کافی ہے،مگر افسوس مسلماں اس سے کوسوں دور ہیں۔نظم ’’اشتراکیت‘‘ میں دعائیہ انداز میں کہتے ہیں:

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مسلماں اللہ کرے تجھے عطا ہو جدت کردار (۱۱)

مسلمانوں میں خود اعتمادی،خود داری،ہمت اور حوصلہ اب نام کو نہیں۔ان کی خودی کی موت واقع ہو گئی ہے۔ان کی انفرادی زندگی زنگ آلود ہو چکی ہے۔وہ اپنی بگڑی کو سنوارنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔خودی،خود پر اعتماد کرنے کا نام ہے۔اقبالؒ نے مسلمانوں کی اس کمزوری کو بہت پہلے بھانپ کر اسرار خودی اور رموز بے خودی کے علاوہ بانگ درا،بال جبریل،جاوید نامہ اور ضرب کلیم میں جا بہ جا خودی کے موضوع پر اشعار کہے ہیں۔انہیں اس بات کا احساس تھا کہ خودی طاقت ور مظہر حیات ہے۔اگر مسلمانوں کی خودداری اور اعتماد بحال ہو جائے تو وہ اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکتے ہیں۔مگر فلسطین کی حالیہ زبوں حالی پر مسلم دنیا کی بے حسی یہ ثابت کرتی ہے کہ با حیثیت قوم ہم پر مرگ طاری ہے۔تمام اسلامی ممالک اپنے ساتھ بھی مخلص نہیں ہیں ایسے میں کسی اور ملک میں رہنے والے اپنے مسلماں بھائی کے لیے تو قربانی دینا بہت دور کی بات ہے۔پروفیسر محمد منور ’’ایقان اقبال‘‘ میں رقم طراز ہیں کہ:

’’جس طرح افراد کو غفلت یا مرگ مجازی سے پالا پڑتا ہے،اسی طرح اقوام بھی متاثر ہوتی ہیں۔مسلم معاشرے نے بھی ایسے انقلابات بار ہا دیکھے ہیں۔سوچنے والے اذہان اور دردمند دل کے مالک افراد

اپنی اپنی جگہ کام کرتے رہے۔مسلمان مایوس نہیں ہوتا تاہم اگر وہ مرحلہ خدانخواستہ آجائے جب افراد معاشرہ یہ سوچنے لگیں کہ ہم کیا کرسکتے ہیں اور پھر خود ہی جواب بھی دے دیں کہ ہم تو کچھ بھی نہیں کرسکتے ،تو جان لیجیے کہ برے دن آن لگے اور اب قوم کا اللہ ہی حافظ ہے۔''ہم تو کچھ بھی نہیں کرسکتے'' کا مرحلہ اس وقت آتا ہے جب بے نظمی اور بے عنوانی عام ہو جائے،اوپر سے نیچے تک افراد معاشرہ کی اکثریت محض اپنی ذاتی غرض وہوس اور فقط اپنی تن پروری کی خاطر کارفرما ہو۔'' (۱۲)

ایک مسلمان کا اپنے دوسرے مسلمان بھائی کے لیے جان اور مال وقف کرنا کوئی بڑی بات نہیں اگر اس کا جذبہ صادق ہو۔مسلمان تو وہ ہے جس کے لیے موت ایک زندگی سے دوسری زندگی پانے کے لیے ایک وقفے کا نام ہے۔جو آخرت کی زندگی کو اس ظاہری زندگی سے ہر حال میں بہتر سمجھتے ہیں۔ان کی نظر میں موت ہلاکت نہیں محبوب برحق سے ملنے کا وسیلہ ہے۔

کشاد در دل سمجھتے ہیں اس کو ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں (۱۳)

یہ بدقسمتی ہے کہ آج کا مسلمان موت سے ڈرتا ہے۔سرمایہ دار ممالک کی جانب سے پڑنے والی افتاد سے ڈرتا ہے۔اس لیے سوچتا ہے کہ میرا مسلمان بھائی مرتا ہے تو مرے۔شہادت تو مرد مومن کے لیے افضل درجہ ہے،جس کی تمنا میں اسلاف نے کفار سے کئی جنگیں لڑیں۔اقبال تو مرد مومن کی زندگی کا حاصل ہی شہادت کو قرار دیتے ہیں۔

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی (۱۴)

بے عملی کی بنیادی وجوہات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مسلمان اب دل کے نہیں بلکہ عقل کے تابع ہیں ہیں۔ عقل کو رہنمائی کا کام سونپا جائے تو نفع ونقصان اور مادی دنیا کے الجھنوں سے ہی باہر نہیں نکلتا۔عقل،جذبات اور تاثر سے عاری شے ہے جو خدا کی راہ میں قربانی یا اپنے ہی بھائیوں کے لیے جان جوکھوں میں ڈالنے سے منع کرتا ہے۔سیاسی و ملکی مفادات کے بارے میں سوچنے کی ترغیب دیتا ہے۔اس کے برعکس عشق کا دوسرا نام اضطراب ہے۔حیات و کائنات کی جاودانی اسی سے ہے۔یہ عشق ہی کا جذبہ ہے جس کی بدولت حضرت ابراہیم نے آتش نمرود میں کودنے سے دریغ نہیں کیا۔ڈاکٹر یوسف حسین خان کے بہ قول:

''اقبال کے نزدیک عقل کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس میں جرات رندانہ کی کمی ہے یعنی بجائے خود وہ تخلیق کی ذمہ داری سے عہدہ برا نہیں ہوسکتی۔جب تک عشق ووجدان اس کی پشت پناہی پر

موجود نہ ہوں وہ خود آگے قدم بڑھاتے ہوئے ہچکچاتی ہے۔ جہاں وہ پس وپیش اور حیض بیض میں ہوتی ہے وہاں عشق زندگی کے قافلے کی رہبری کرتا ہے۔ چنانچہ انسانی تاریخ گواہ ہے کہ وہ تمام امور جن سے قوموں کی زندگی بدل گئی کسی نہ کسی جذبے کے تحت انجام پائے ہیں۔"(۱۵)

امت مسلمہ کو اب اپنی حالت زار پر رحم کرنا چاہیے۔ نصاری، یہود و ہنود کے جابرانہ تسلط سے نکل کر انہیں اپنی خودی وخوداری، جذبہ عشق اور اسلامی امت کے لا زوال تصور کو سینچنا ہوگا۔ مختلف قومیتوں کے تصور سے نکل کر اسلامی قومیت کے بارے میں سوچنا ہوگا۔ تب ہی اقبالؔ کی نا تمام آرزوؤں کی تکمیل ہوگی۔ اللہ کرے ان کی یہ دعا رائیگاں نا جائے، جو نظم "طارق کی دعا اندلس کے میدان جنگ میں" موجود ہے۔

دل مرد مومن میں پھر زندہ کر دے وہ بجلی کہ تھی نعرۂ "لا تذر" میں (۱۶)
عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے نگاہ مسلماں کو تلوار کر دے

حوالے:

۱۔ محمد اقبال، ڈاکٹر، علامہ: نظم "شام و فلسطین"، مشمولہ، "ضرب کلیم"، ص ۱۴۹۔ ۱۵۰۔
۲۔ محمود علی، شاہ، ڈاکٹر: "مسلم مفکرین اور سیاسی افکار"، ص ۸۷۔ ۸۸۔
۳۔ محمد اقبال، ڈاکٹر، علامہ: نظم "شکوہ"، مشمولہ "بانگ درا"، ص ۱۶۴۔
۴۔ رفیع الدین، ہاشمی: اقبال کی طویل نظمیں"، ص۔ ۵۸۔
۵۔ محمد اقبال، ڈاکٹر، علامہ: نظم "جواب شکوہ"، مشمولہ "بانگ درا"، ص ۲۰۳۔
۶۔ محمد اقبال، ڈاکٹر، علامہ: نظم "خضر راہ"، مشمولہ "بانگ درا"، ص ۲۶۳۔
۷۔ محمد اقبال، ڈاکٹر، علامہ: نظم "شکوہ"، مشمولہ "بانگ درا"، ص ۱۶۶۔
۸۔ محمد اقبال، ڈاکٹر، علامہ: نظم "جواب شکوہ"، مشمولہ "بانگ درا"، ص ۲۰۲۔
۹۔ محمد اقبال، ڈاکٹر، علامہ: نظم "طلوع اسلام"، مشمولہ "بانگ درا"، ص ۲۷۱۔
۱۰۔ محمد اقبال، ڈاکٹر، علامہ: نظم "جواب شکوہ"، مشمولہ "بانگ درا"، ص ۲۰۴۔
۱۱۔ محمد اقبال، ڈاکٹر، علامہ: نظم "اشتراکیت"، مشمولہ، "ضرب کلیم"، ص ۱۳۰۔
۱۲۔ محمد منور، پروفیسر: "ایقان اقبال"، ص ۱۷۱۔
۱۳۔ محمد اقبال، ڈاکٹر، علامہ: نظم "طارق کی دعا (اندلس کے میدان جنگ میں)"، مشمولہ، "بال جبریل"، ص ۲۰۳۔

۱۴۔ محمد اقبال، ڈاکٹر، علامہ: نظم "طارق کی دعا (اندلس کے میدان جنگ میں)"، مشمولہ: "بال جبریل"، ص ۱۰۲۔

۱۵۔ یوسف حسین خان، ڈاکٹر: "روح اقبال"، ص۔ ۶۱۔

۱۶۔ محمد اقبال، ڈاکٹر، علامہ: نظم "طارق کی دعا (اندلس کے میدان جنگ میں)"، مشمولہ: "بال جبریل"، ص ۱۰۳۔

کتابیات:

۱۔ رفیع الدین، ہاشمی: اقبال کی طویل نظمیں"، ۲۰۱۴ء، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۴۸۔

۲۔ محمد اقبال، ڈاکٹر، علامہ: "کلیات اقبال (اردو)، ۲۰۰۹ء، اسد نیئر پرنٹرز، لاہور۔

۲۔ محمد منور، پروفیسر: "ایقان اقبال"، ۱۹۸۴ء، اقبال اکادمی ادبیات، لاہور، ۲۴۶۔

۳۔ محمود علی، شاہ، ڈاکٹر: "مسلم مفکرین اور سیاسی افکار" عبدالغفور اسٹیشری مارٹ، کوئٹہ، ۱۲۷۔

۴۔ یوسف حسین خان، ڈاکٹر: "روح اقبال"، ۱۹۶۳ء، آئینہ ادب، لاہور، ۵۱۱۔

***

Editorial Board

Iftikhar Arif, Ex,DG, Idara e Forogh e Urdu Pakistan,Islamabad

Dr. Muhammad Saleem Akhtar, Ex Honorary Editor, Pegham-e-Ashna

Dr. Hilal Naqavi,Pak Study Centre, Karachi University, Karachi

Dr.Mehr Noor Mohammad Khan, Ex-Chairperson، Dept.of Persian NUML, Islamabad

Dr. Mohammad Yousaf Khushk, Ex-Chairperson Academy of letters Pakistan, Islamabad

Dr. Shugufta Mosavi, Ex HOD, Persian Department, NUML, Islamabad

Dr. Ambar Yasmeen, HOD, Persian Department, NUML, Islamabad

Advisory Board

Dr.Ibrahim Mohammad Ibrahim, Chairperson، Dept.of urdu, Al Azhar University, Egypt

Dr. Haider Raza Zabit, Islamic Research Centre, Astan-e-Quds Rizvi, Mashad, Iran

Dr.Khalil Tauq Aar, Chairperson،Dept,.of urdu Ankara University, Istanbul, Turkey

Prof.Sahar Ansari, Anjuman Taraqi e Urdu , Karachi.

Dr.Abdullah Jan Abid,Chairperson، Department of Pakistani Languages, AIOU,Islamabad

Dr. Iraq Raza, Chairperson Dept.of Persian Jamia Milia Islamia, Dehli, India

Dr. Ali Bayat, Chairperson Dept.of urdu, Tehran University, Tehran, Iran

Dr. Maqsood Ilahi Sheikh, Research Scholar, Bradford, England

Dr. Mohammad Nasir, Chairperson Dept.of Persian, Oriental College, UoP, Lahore

Dr. Najeeba Arif, Chairperson Academy of letters Pakistan, Islamabad.

PAYGHAM-E-ASHNA

ISLAMABAD - PAKISTAN

Vol. 22, S.No.93

(October to December) 2023

(Iqbal Edition)

Chief Editor

Ehsan Khazaei

Editor

Dr. Ali Kumail Qazalbash

Cultural Consulate

Embassy of Islamic Republic of Iran, Islamabad

House No. 25, Street No 27, F-6/2, Islamabad, Pakistan

Ph:051 2827937-8 Fax: 051 2821774

Email: iran.council@gmail.com, payghameashna@gmail.com

ur.icro.ir/IslamAbad// Web: http:

ISSN: 2079-4568

Payghame Ashna

VOL. 22, S.NO. 93
(OCTOBER TO DECEMBER) 2023

رایزنی فرهنگی سفارت جمهوری اسلامی ایران - اسلام آباد

ISSN: 2079-4568